دہشت گردی کے خلاف جنگ
پاک امریکہ تعاون اور اس کے اثرات

جلد اوّل

پروفیسر خورشید احمد

آئی پی ایس پریس، اسلام آباد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز تحقیق کے لیے آزادانہ اظہار خیال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے
ادارہ کی مطبوعات میں پیش کیے گئے تمام خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

© IPS Press 2021

دہشت گردی کے خلاف جنگ، پاک امریکہ تعاون اور اس کے اثرات (جلد اوّل)

پروفیسر خورشید احمد

انتخاب، ترتیب و تدوین: خالد رحمٰن

معاونت: عارف جمشید، محمود فاروقی، سلمان طاہر

ISBN: 978-969-448-811-0

جملہ حقوق محفوظ ہیں: آئی پی ایس پریس، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کے کسی حصے کی نقل یا ترجمہ کی اشاعت، کسی بھی شکل میں اسٹور تیج جہاں سے اسے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہو یا کسی بھی شکل میں ترسیل نہیں کی جاسکتی۔

۳۲۷٫۵۴۹۰۷۳ دہشت گردی کے خلاف جنگ، پاک امریکہ تعاون اور اس کے اثرات، جلد اول
خ ور خورشید احمد، پروفیسر
اسلام آباد: آئی پی ایس پریس، ۲۰۲۱ء
۲۰۶ صفحات مع اشاریہ
۱۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ اور پاکستان ۲۔ پاکستان-خارجہ تعلقات-امریکہ

آئی پی ایس پریس

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، نصر چیمبرز، پلاٹ-1، ایم پی سی ایچ ایس، کمرشل سینٹر، E-11/3، اسلام آباد
فون: ۰۵۱-۸۴۳۸۳۹۱ فیکس: ۰۵۱-۸۴۳۸۳۹۰
ای میل: publications@ips.net.pk
ویب سائٹ: www.ipsurdu.com, www.ips.org.pk
فیس بک: IPSPressInternational

سرورق: آصف تیموری
الفاظ و صفحہ سازی: طاہر احمد عباسی، محمد عالم
طباعت: فضلی سنز، کراچی

فہرست

- پیش لفظ V
- تعارف VII

دہشت گردی کے خلاف جنگ، پاک امریکہ تعاون اور اس کے اثرات - جلد اوّل

حصہ اول: خارجہ پالیسی کے تقاضے اور عمل درآمد

- خارجہ پالیسی کی تشکیل اور اس کے عنوانات ۰۳
- ۹/۱۱ کے بعد امریکہ کے ساتھ تعاون کی پالیسی ۱۷
- امریکی صدر بش کا دورہ پاکستان اور دوطرفہ تعلقات ۳۷
- گوانتاناموبے میں قرآن کی بے حرمتی اور پاک امریکہ تعلقات ۵۱
- پاکستان کا ایٹمی پروگرام، امریکی دباؤ اور اثرات ۶۹
- ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور پاکستان کی ایٹمی صلاحیت ۸۳
- ایٹمی پروگرام کی بحث عالمی تناظر میں ۹۷
- سفارت کاری کے آداب، امریکی رویہ اور ہمارا طرز عمل ۱۰۱
- غیر سفارتی اور غیر قانونی امریکی اقدامات پر ردعمل ۱۲۱

حصہ دوم: امریکہ کی عالمی پالیسیاں اور ان پر ردِ عمل

- عراق پر حملہ - امریکی عزائم اور جرائم ۱۳۹
- عراق پر امریکی حملہ کے مضمرات ۱۴۹
- توہین رسالتؐ پر مبنی خاکوں کی اشاعت اور احتجاج ۱۶۵
- دوسری اسرائیل۔ حزب اللہ جنگ ۱۷۱
- ضمیمہ: 'دہشت گردی کے خلاف جنگ: پاک امریکہ تعاون اور اس کے اثرات' جلد دوم کی فہرست عنوانات ۱۸۲
- اشاریہ ۱۸۳

پیش لفظ

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو بیش بہا انعامات سے نوازا ہے۔ ایک جانب دیگر ہزاروں مخلوقات کی طرح اس کی جسمانی اور طبعی ضروریات کو پورا کرنے کا انتظام فرمایا، تو دوسری جانب اس کا رتبہ ان تمام مخلوقات سے بلند کر کے اس کی اخلاقی، تہذیبی، تمدنی اور روحانی نشوونما کو بھی اپنے ذمہ لے لیا۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے سوا لاکھ کے قریب انبیاء علیہم السلام دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف اوقات میں مبعوث فرمائے، یہ سلسلہ حضرتِ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت محمد ﷺ پر تکمیل پذیر ہوا۔ ان انبیاء کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی علمی، اخلاقی اور فلسفیانہ ہدایت کے لیے وحی کا ایک سلسلہ شروع کیا جو قرآنِ کریم پر منتج ہوا۔ آخری پیغمبر ﷺ کی آمد کے ساتھ جہاں کارِ نبوت تکمیل کو پہنچا، وہیں قرآنِ کریم کی تکمیل کے ذریعے الہامی ہدایت کا سلسلہ مکمل ہوا۔ یوں قرآن و سنت کی صورت میں ایک ایسا نقشۂ زندگی انسانیت کو میسر آگیا جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر دائرے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

انسانیت کے ارتقا اور علم و عمل کے نئے ذرائع کی دریافت نے انسان کو کسی حد تک آزادیِ فکر سے نوازا تو وہ اس خام خیالی کا شکار ہو گیا کہ وہ اب الہامی ہدایت سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ ظلم، عدم مساوات اور طاغوتی طاقتوں کے غلبے کی صورت میں نکلا۔ اسی خام خیالی نے دنیا کو اس استعماری نظام کے شکنجے میں لا ڈالا جس کی ہر صورت افراد اور اقوام کے استحصال پر منتج ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے فی زمانہ انسانی زندگی کے تمام دائرے اور تمام شعبے اس سے براہِ راست متاثر ہیں۔ اس پر مستزاد وہ ذہنی پسماندگی اور مغلوبیت کی کیفیت ہے جس کی وجہ سے کسی متبادل کی تلاش میں انسانوں کی اکثریت سرگرداں ہونے کے باوجود محروم ہے۔

میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم و تحقیق، تصنیف و تالیف، اور سیاسی تحرّک میں گزارا ہے۔ اس پورے عرصے میں میری کوشش یہی رہی کہ حتمی الہامی ہدایت یعنی قرآن و سنت کی

جامع تعلیمات کی روشنی میں قومی اور بین الاقوامی مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ چنانچہ علمی و عملی جدوجہد کے دوران یہ مقصد میرا مرکزِ نگاہ تھا کہ اپنی صلاحیت اور دائرہ اختیار کے مطابق وطنِ عزیز پاکستان کو بالخصوص اور عالمِ انسانیت کو بالعموم استعماری گرفت سے آزاد کروا کر فلاح و ہدایت کے اس راستے پر گامزن کرنے کی جدوجہد میں اپنا حصہ شامل کیا جا سکے جو الہامی ہدایت کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

اس ضمن میں نظریاتی و عملی پہلوؤں پر میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق سے سینکڑوں مضامین تحریر کیے ہیں اور بے شمار مواقع پر گفتگو کی صورت میں اپنے خیالات کا ابلاغ کیا ہے۔ اس میں سے بہت کچھ گزشتہ دہائیوں میں مربوط صورت میں شائع بھی ہوا ہے لیکن ایک بہت بڑا لوازمہ ابھی ایسا موجود ہے جسے ترتیب دینے کی ضرورت باقی ہے۔ یہ فرض انجام دینے کی خواہش میں کئی برس سے اپنے اندر پاتا ہوں لیکن صحت کی صورت حال کے باعث یہ ممکن نہ ہو سکا کہ اپنے ماضی کے کام کا جائزہ لے کر اسے اشاعت کے لیے مرتب کر سکتا۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ساتھیوں نے برادرم خالد رحمٰن کی سربراہی میں اس ادھورے کام کی تکمیل کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ پہلے مرحلے میں پاکستان کی نظریاتی اساس، ملک میں آئینی جدوجہد، طرز حکمرانی کے سوال، دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاک امریکہ تعاون، اسلام اور مغرب کے باہمی تعلق اور جاری کشمکش، اور معاشی صورت حال اور امکانات جیسے موضوعات پر سات کتب مرتب ہو چکی ہیں۔ کچھ دنوں میں تین اور کتب بھی مکمل ہونے کو ہیں، ان شاءاللہ۔ ان کتب کا حصہ بننے والے بیشتر مضامین میری سینیٹ کی تقاریر پر مبنی ہیں جبکہ دیگر مضامین مختلف مواقع پر لکھے گئے جن کو اب یکجا کر دیا گیا ہے۔

میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے انتہائی محنت، عرق ریزی اور قابلیت کے ساتھ یہ لوازمہ ترتیب دیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہماری سعی کو قبول فرمائے اور ہماری کاوشوں کو اپنے لیے خالص کر لے۔

لیسٹر، برطانیہ — پروفیسر خورشید احمد

۲۸ مئی ۲۰۲۱ء

تعارف

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے ردِ عمل میں امریکی حکومت نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اعلان کیاتو پاکستان میں اس وقت جنرل پرویز مشرف کی حکومت تھی۔ جنرل مشرف نے امریکہ کی زیر قیادت اس جنگ میں تعاون کا اعلان کیا۔ بعد میں آنے والی رپورٹس سے یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے کہ جنگ میں تعاون کے لیے شرائط کار اور ان پر عملدرآمد کے حوالہ سے اس نہایت اہم پالیسی فیصلے میں جنرل پرویز مشرف نے فوری طور پر کسی بھی دوسرے فرد یا ادارے کو اعتماد میں لینے اور اس سے مشاورت کا اہتمام نہیں کیا تھا۔ نتیجتاً خارجہ پالیسی کی سطح پر بھی اور عملدرآمد کے لیے طریقہ کار کے بارے میں بھی فیصلہ کے وقت ابہام موجود تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ۲۰ سال گزرنے کے باوجود اس ضمن میں بہت سے سوالات ابھی تک جواب طلب ہیں۔

خارجہ، دفاع اور سلامتی کے میدان ایسے ہیں جہاں بعض اوقات پالیسیوں میں ابہام حکمت عملی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ سوچ سمجھ کر رکھا جانے والا یہ ابہام اقدامات کے ایک مربوط سلسلہ سے جڑا ہوتا ہے۔ تاہم اگر یہ ابہام کسی قومی مفاد میں نہیں بلکہ کسی فرد کی ذاتی مجبوریوں کی بنیاد پر ہو، مشاورت کے بغیر ہو اور شفافیت کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے کے لیے رکھا جائے تو یہ ایک جانب داخلی سطح پر عدم اعتماد کا ماحول پیدا کرتا ہے اور یوں پالیسیوں کی درست تشکیل اور ان پر مؤثر عملدرآمد ناممکن ہو جاتا ہے، دوسری جانب یہ صورتحال فریق ثانی کو، بالخصوص جبکہ طاقت اور وسائل کا عمومی توازن بھی اس کے حق میں ہو، موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ شرائط کار میں ابہام کا اپنے حق میں فائدہ اٹھائے۔ یوں دوطرفہ تعاون کی سپرٹ عملاً یک طرفہ معاونت میں بدل جاتی ہے۔ اس سارے عمل میں طاقتور فریق کا دباؤ بڑھتا چلا جاتا ہے اور پہلے سے کمزور دوسرے فریق کی پوزیشن کمزور تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ میں پاکستان کی شراکت کی عملی صورت یہی رہی۔ اسی لیے اس جنگ کے دوران خارجہ پالیسی کی تشکیل ہو اور یا اس پر عملدرآمد، پاکستانی حکومت شدید دباؤ کا شکار رہی۔ دوسری جانب امریکی حکومت نے ان سفارتی آداب کا بھی خیال نہیں رکھا جن کا عام دوطرفہ تعلقات کے دوران بھی اہتمام ضروری ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دوران سفارتی آداب ہی نہیں بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی بھی امریکہ کی جانب سے مسلسل کی جاتی رہیں۔ فطری طور پر اس صورت حال نے پاکستان کی اندرونی صورت حال، اس کے بارے میں عالمی رائے عامہ اور بین الاقوامی امیج پر بھی نہایت منفی اثرات ڈالے۔ فطری طور پر حکومت کی قوت کار پر بھی اس کے منفی اثرات مرتب ہوئے جن کی قیمت آج تک قوم کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔

اس دوران ۲۰۰۲ میں ملک میں عام انتخابات کے نتیجہ میں پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آنا بہر حال ایک خوش آئند پیش رفت تھی۔ حکمرانی تو عملاً اس وقت بھی شخصی ہی تھی کہ جنرل پرویز مشرف فوج کے سربراہ اور صدر ہونے کی بناء پر اپنے آپ کو عقل کل سمجھتے ہوئے تمام کلیدی فیصلوں پر اثرانداز ہونا چاہتے تھے۔ تاہم انتخاب کے بعد پارلیمنٹ کی صورت میں کم از کم ایک ایسا پلیٹ فارم وجود میں آگیا جہاں قومی اور حکومتی پالیسیوں پر غور و فکر، بحث اور ایک متبادل نقطۂ نظر پیش کرنے کے مواقع موجود تھے۔

پروفیسر خورشید احمد پاکستانی پارلیمنٹ کے ایوان بالا کے چار مرتبہ رکن منتخب ہوئے۔ ہر دور میں ایوان کی کارروائیاں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ وہ اس ایوان کے ان ارکان میں شامل ہیں جنہوں نے قومی مسائل پر بحث و مباحثہ میں اپنے کردار سے اس ایوان کے وقار کو بلند کیا۔ سیاسی اور گروہی مفاد کو نظر انداز کر کے قومی اور ملی نقطۂ نظر کی بنیاد پر اور سطحی اور وقتی پہلو سے آگے بڑھ کر وسیع تر تناظر میں مسائل کو سمجھنا اور ان کا تجزیہ کرتے ہوئے لائحہ عمل کے لیے تجاویز دینا ان کا طرہ امتیاز ہے جو سینیٹ میں ان کی ہر تقریر اور گفتگو میں جھلکتا ہے۔

دو جلدوں پر مبنی زیر نظر کتاب پارلیمنٹ کے ایوان بالا میں پروفیسر خورشید احمد کی ان تقاریر کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے جو دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ میں تعاون کے ضمن میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشکیل، اس کی مختلف جہات، نوعیت اور اس بارے میں کیے جانے والے فیصلوں کے اثرات سے بحث کرتی ہیں۔ موضوعات کی مناسبت سے انہیں دو جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

جلد اول کا پہلا حصہ خارجہ پالیسی کی تشکیل کے تقاضوں کی نشان دہی کے بعد دہشتگردی کے خلاف جنگ میں تعاون کے دوران مختلف مراحل اور پیش آنے والے مختلف واقعات پر عمل درآمد اور پاکستان کے لیے ان کے اثرات سے بحث کرتا ہے۔ اس حصہ کا پہلا جزو پاکستان اور امریکہ کے درمیان دوطرفہ معاملات سے متعلق ہے۔ جبکہ دوسرا جزو ان عالمی حالات و واقعات سے متعلق ہے جن پر پاکستان امریکی دباؤ کی بناء پر اپنے مفاد میں اور انصاف کی بنیاد پر اقدام کرنے سے معذور رہا اور یا گریز کرتا رہا۔

دوسری جلد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاک امریکہ تعاون کے ان اثرات سے بحث کرتی ہے جو براہ راست پاکستان اور پاکستانیوں کے حالات پر اثر انداز ہوئے۔ ان اثرات کا دائرہ یوں تو زندگی کے ہر دائرہ تک پھیلا ہوا ہے لیکن کتاب کے اس حصہ میں یہ ان امور سے بحث کرتی ہے جو داخلی سلامتی اور امن وامان سے متعلق ہیں۔

پارلیمنٹ میں بحث کے دوران کی گئی تقاریر کی اہمیت پاکستان کی تاریخ کے ایک اہم موڑ پر پیش آنے والے واقعات اوران کے پس منظر و پیش منظر کو سمجھنے کے علاوہ خود پارلیمنٹ کے کردار، اس کی کارکردگی اور یہاں بحث کے طریقہ کار کو سمجھنے کے لیے بے حد مفید ہے۔ دوسری جانب اس مرتب شکل میں یہ مستقل راہنمائی فراہم کرتی ہیں کہ دوطرفہ اور کثیر جہتی تعلقات کے لیے خارجہ پالیسی اور اس کے مقتضیات کیا ہیں۔ پالیسی کو کس طرح دیگر پالیسیوں سے مربوط ہونا چاہیے اور اس پر عملدرآمد کے لیے مختلف اداروں کو کس طرح کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اور اگر یہ سب کچھ درست بنیادوں پر اور مؤثر انداز سے نہ ہو تو نتائج

کس قدر بھیانک اور تباہ کن ہو سکتے ہیں۔

امریکہ دنیا کے اہم ترین ملکوں میں سے ہے۔ چنانچہ تمام تر اتار چڑھاؤ کے باوجود پاکستان میں پالیسی سازوں نے امریکہ کے ساتھ ہمیشہ ہی نباہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جواباً پاکستان نے اس کی کیا قیمت ادا کی ہے اس کا کچھ اندازہ اس کتاب میں شامل مضامین سے بھی ہو جاتا ہے۔ آنے والے دنوں میں پاکستان کے لیے امریکہ کے ساتھ تعلقات کی کیا حکمت عملی ہو کہ وہ طاقتور فریق کے لیے یکطرفہ مفادات کی بجائے حقیقی دوطرفہ مفادات پر منتج ہو سکے۔ یہ وہ سوال ہے جو پاکستانی پالیسی سازوں کو آج بھی درپیش ہے اور آئندہ بھی درپیش رہے گا۔ اس سیریز کی دیگر کتب میں ہر باب کے آغاز میں زیر بحث مضمون کا سیاق وسباق کے طور پر تعارفی نوٹ دیا گیا ہے۔ البتہ زیر نظر جلد کے مضامین حصوں میں تقسیم ہیں اور ہر حصہ کا مجموعی سیاق وسباق تحریر کر دیا گیا ہے۔

اس مجموعی تناظر میں یہ کتاب پاکستان کی سیاست، بین الاقوامی تعلقات اور دہشت گردی اور اس کے خلاف جنگ کے حوالہ سے قانونی اور سیاسی پہلوؤں پر ایک بے حد اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ توقع غلط نہ ہو گی کہ اپنے مباحث کی بناء پر یہ آج کے اور آنے والے پالیسی سازوں ہی کے لیے نہیں بین الاقوامی، سیاسی اور دفاعی امور پر نظر رکھنے والے ماہرین اور طالب علموں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنے گی۔

خالد رحمٰن

چیئرمین

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد

خارجہ پالیسی کے تقاضے اور عمل درآمد

۹/۱۱ (۲۰۰۱ء) کے واقعات کے نتیجہ میں امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ اس وقت پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کی حکومت قائم تھی۔ امریکہ کی جانب سے تعاون طلب کرنے پر جنرل مشرف نے فوری آمادگی ظاہر کی۔ آنے والے دنوں میں پاکستان کی حکومت نے امریکہ اور اس کی فوجوں کو افغانستان میں کارروائیوں کے لیے انٹیلی جنس اور رسد کے علاوہ فضائی اڈوں اور حدود کے استعمال کی اجازت بھی دی۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی اور اسی حوالہ سے افغانستان پاکستان اور امریکہ تعلقات کی تکون میں یہ ایک نیا اور بہت غیر معمولی موڑ تھا۔ دوسری جانب بظاہر یہ موڑ دو ملکوں کے درمیان تعاون کی علامت قرار دیا گیا لیکن درحقیقت یہ پاک امریکہ تعلقات میں امریکی دباؤ کی ایک نئی علامت بن کر ابھرا جس کے بہت سے منفی اثرات پاکستان کی خارجہ پالیسی کے دائرے کے علاوہ قومی اور داخلی سلامتی کے لیے بھی خطرناک صورت میں سامنے آئے۔ کتاب کی جلد اوّل میں شامل تحریریں اسی حوالہ سے دو عنوانات 'خارجہ پالیسی کے تقاضے اور عمل درآمد' (حصہ اول) اور 'امریکہ کی عالمی پالیسیاں اور ان پر ردعمل' (حصہ دوم) کے تحت پیش کی گئی ہیں۔

خارجہ پالیسی کی تشکیل اور اس کے عنوانات

جناب چیئرمین! انتخابات کے نتیجہ میں منتخب ہو کر آنے والی حکومت کی خارجہ پالیسی کے ابھی بہت مختصر سے خدو خال نظر آرہے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس ملک پر پچھلے ساڑھے آٹھ سال سے (پرویز مشرف کے دور میں) جو خارجہ پالیسی مسلط کی گئی اور جسے کم از کم پانچ سال تک پاکستان مسلم لیگ (ق) اور اس کے حواریوں نے کندھا دیا، وہی پالیسی عملاً اس وقت نافذ ہے، میری نگاہ میں اس وقت اس خارجہ پالیسی کو جاری رکھنے کی بجائے آج کی سب سے بڑی ضرورت اس پالیسی کا جائزہ لے کر اسے نئے سانچوں میں ڈھالنا ہے۔ میں اسی لیے اس گفتگو میں افراد کا معاملہ زیر بحث لانے سے گریز کرتے ہوئے اسی قسم کے دوسرے مسائل کو بھی نظر انداز کرنا چاہوں گا۔

جناب والا! میری گفتگو کا محور دو شعبے رہیں گے۔ پہلا خارجہ پالیسی کا جوہری مسئلہ ہے۔ جس کے معنی اس کے مقاصد اور اس کی سمت متعین کرنے کے علاوہ قومی مفادات اور قومی خطرات کے تصورات کا تعین ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری جانب اسی پس منظر میں بین الاقوامی ضروریات اور داخلی مجبوریوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک پالیسی بنانے سے متعلق امور ہیں۔ یہ خارجہ پالیسی بنانے کا جوہری حصہ ہے۔ دوسرا حصہ طریقہ عمل سے متعلق ہے، وہ یہ ہے کہ خارجہ پالیسی کس طرح بننی چاہیے۔ خارجہ پالیسی سے جن کے مفادات وابستہ ہیں وہ کون کون ہیں اور اس کی روشنی میں فیصلہ سازی کہاں ہونی چاہیے۔ میری نگاہ میں ان دونوں پہلوؤں سے بڑی خرابیاں اور بڑا بگاڑ موجود ہے۔ میری دعا ہے کہ ہمارے متحرک وزیر خارجہ جناب شاہ محمود قریشی جن کی ذات سے مجھے اچھی توقعات ہیں،

اس معاملے میں نئے قدم اٹھائیں گے اور کھلے ذہن کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کریں گے۔ محدود وقت میں ساری بحث کو سمیٹنا فی الحقیقت مشکل کام ہے لیکن اس وقت چند اہم نکات پر خصوصی طور پر توجہ مرتکز کرنا چاہوں گا۔

خارجہ پالیسی اور قومی مقاصد

پہلی بات جو میں بڑے دکھ سے کہہ رہا ہوں لیکن یہ میرا دیانتدارانہ تخمینہ ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی جسے پاکستان کی خارجہ پالیسی ہونا چاہیے وہ اس وقت عملاً پاکستان کی خارجہ پالیسی نہیں ہے۔ بار بار شبہ ہوتا ہے کہ وہ پاکستان کے لیے غیر ملکیوں کی بنائی ہوئی پالیسی ہے اور اس کی تشکیل میں ہمارے دفتر خارجہ کا کردار بڑا محدود رہا ہے۔ فیصلے کہیں اور ہوتے ہیں اور خاص طور پر گزشتہ دونوں ادوار (۲۰۰۲-۱۹۹۹ اور ۲۰۰۷-۲۰۰۲ء) جن میں اقتدار حکومت ایک شخص کے ہاتھوں میں مرکوز رہا، اس میں قومی مفاد، قومی مقاصد، قومی امنگوں اور فیصلہ سازی کے طریقہ کار کو نظر انداز کر کے پالیسیاں بنائی گئی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پالیسیاں بیرونی اثر یا بیرونی دباؤ اور خوف کے تحت بنی ہیں۔

یہ بات سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ جو پالیسی خوف اور دباؤ کے تحت بنے گی، وہ کبھی صحت مند اور مفید پالیسی نہیں ہوگی اور یہی ہمارا المیہ رہا ہے۔ میں کوئی ریاستی راز فاش نہیں کر رہا ہوں۔ مشاہد صاحب بھی میری بات کی تصدیق کریں گے کہ سینیٹ کی خارجہ امور کمیٹی کے اجلاس میں خود وزیر خارجہ کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ کشمیر کے معاملے میں اقوام متحدہ کی قرار دادوں کو ایک طرف کرنے کی جو بات (جنرل پرویز مشرف کی جانب سے) کہی گئی اس کی اطلاع انہیں اخبار سے ہوئی۔ بالکل اسی طرح جس طرح مجھے اور آپ کو ہوئی۔ جناب والا! یہ معاملات بڑے سنگین ہیں۔ مجھے پورا احساس ہے کہ خارجہ پالیسی کی تشکیل میں بین الاقوامی عدم موافقت کا بھی کردار ہوتا ہے اور داخلی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں، انہیں آپ نظر انداز نہیں کر سکتے لیکن پالیسی بنانے کے مقاصد قوم کی امنگوں، مفادات اور خطرات سے آگہی کے

تناظر میں طے کیے جاتے ہیں۔ جب تک کہ آپ اس پر توجہ مرتکز نہیں کریں گے آپ کبھی بھی صحیح خارجہ پالیسی نہیں بنا سکتے۔

پالیسی کی تشکیل میں وزارت خارجہ کا کردار

جناب والا! دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خارجہ پالیسی کی تشکیل میں وزارت خارجہ کا ایک اہم کردار ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ خود وزارت خارجہ کے اندر پالیسی تحقیق کا کام بڑے منظم اور مرتب انداز میں اور گہرائی کے ساتھ کیا جائے۔ ہمارے ہاں اس کی روایات موجود نہیں ہیں۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۷۹ء کے دوران میں جب مجھے پلاننگ کمیشن میں سربراہ کے طور پر کابینہ میں کام کرنے کا موقع ملا، اس موقع پر جن مسائل کو میں نے اٹھایا، ان میں سب سے پہلا یہی نکتہ تھا۔ اس وقت ایک فیصلہ ہوا کہ وزارت میں ریسرچ اور پالیسی ونگ ہو گا جو تمام متعلقہ دائروں میں ریسرچ کی بنیاد فراہم کرے گا۔ اس وقت کچھ ابتداء بھی ہوئی لیکن اس کے بعد اور تمام چیزوں کی طرح یہ عمل بھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ میں مشورہ دوں گا کہ خارجہ پالیسی پیش کرنے کے لیے اصل مقام وزارت خارجہ ہے اور وہاں بھی تحقیق و تجزیہ کا پورا اہتمام ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ نجی شعبہ میں علمی و تحقیقی ادارے موجود ہیں اور خود ریٹائرڈ سیکرٹریز اور سابق سفارتکاروں کی ایک اچھی کھیپ موجود ہے جن کی مہارت اور تجربہ کو آپ ادارتی سطح پر اس عمل میں استعمال کر سکتے ہیں۔

پالیسی کی تشکیل میں پارلیمنٹ کا کردار

جناب والا! تیسرا پہلو یہ ہے کہ پالیسی صرف کابینہ نہ بنائے بلکہ اس کو پارلیمنٹ میں آنا چاہیے۔ اس کے لیے میری تجویز یہ ہے کہ جس طرح قومی صورتحال پر بحث کا امریکہ میں ایک رواج ہے، ہمارے ہاں بھی سال میں کم از کم ایک بار خارجہ پالیسی پر دونوں ایوانوں میں بحث و مباحثہ ہو جس کا آغاز وزارت خارجہ یا وزیر خارجہ کے ایک تفصیلی بیان کے ذریعے ہو۔ اس بیان میں متعین حدود اور وزارت کے پیش نظر جو آئندہ کے منصوبے ہیں وہ سامنے

آئیں۔ اس پر پارلیمنٹ مباحثہ کرے اور کمیٹیاں بحث کریں۔ پھر میں یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں جیسا کہ ابھی مشاہد حسین سید صاحب اور رضا ربانی صاحب نے بھی اشارہ کیا کہ کم از کم بیرونی معاہدات اور یادداشتوں (MoUs) کا جائزہ اور توثیق تو لازماً پارلیمنٹ میں ہونا چاہیے۔ اس وقت کا طریق کار ایک نو آبادیاتی ورثہ ہے کہ یہ کام کابینہ کو تفویض کر دیا گیا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ پارلیمنٹ کو اطلاع بھی نہیں ہوتی۔ یہ ایک بڑا ہی اہم پہلو ہے جس کی طرف طریقہ کار کے ضمن میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ خارجہ پالیسی کی تشکیل اور پیشکش میں پارلیمنٹ اور دفتر خارجہ کا تعلق کیا اور کیسے ہو۔

خارجہ پالیسی کے عنوانات

جناب والا! پالیسی کی تشکیل کے طریق کار کے بعد اب میں موضوع کے دوسرے حصے پر آنا چاہتا ہوں یعنی خارجہ پالیسی کے عنوانات۔

دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ: ہم چاہیں یا نہ چاہیں بد قسمتی سے اس وقت خارجہ پالیسی کے موضوعات میں سب سے اہم ایشو امریکہ اور دہشت گردی کے خلاف نام نہاد امریکی جنگ میں ہمارا کردار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی سب سے اہم مسئلہ ہے اور درحقیقت باقی ساری چیزیں اس کے ارد گرد گھوم رہی ہیں۔ میری نگاہ میں امریکی جنگ میں اپنے کردار پر آپ کو نظر ثانی کرنا پڑے گی۔ میں آپ سے یہ بات صاف کہنا چاہتا ہوں کہ معصوم انسانوں کے خلاف قوت کا استعمال سیاسی مقاصد کے لیے ہو تو یہ غلط اور گناہ ہے اور اس کو کسی شکل میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مجبور اور محبوس انسان اپنے حق کے لیے نو آبادیاتی حکمرانوں، قابضین اور ظالموں کے خلاف جو جدوجہد کرتے ہیں اس جدوجہد میں اگر تشدد اور طاقت کا استعمال بھی ہو تو اسے دہشت گردی نہیں کہا جا سکتا۔ جناب والا! میں اس سلسلہ میں اس وقت صرف ایک ریفرنس آپ کو دینا چاہتا ہوں۔

"سیاسی ترجیحات کے مسئلے کے سبب دہشت گردی کی تعریف کے تعین پر ابھی

تک اتفاق نہیں ہو سکا۔ ایک شخص جو کسی کی نظر میں دہشت گرد ہے وہی شخص کسی اور کی نظر میں جنگ آزادی کا سپاہی ہو سکتا ہے۔

بحوالہ Terrorism – The Definitional Problem by Alex Schmid. Case Western Reserve Journal of International Law: Vol 36, Issue 2 (2004), School of Law, Case Western Reserve University.

جناب والا! دہشت گردی بذات خود کوئی نظریہ اور مقصد نہیں ہے۔ دہشت گردی ایک کارروائی ہے جس کو آپ اس وقت تک سمجھ نہیں سکتے اور جس سے آپ نمٹ نہیں سکتے جب تک کہ ان مقاصد اور اس صورت حال کو نہ جانیں جن سے وہ جڑی ہوئی ہے۔ اس وقت بد قسمتی سے امریکہ نے ان مقاصد کے لیے جو وہ تنہا سپر پاور کے طور پر، دنیا میں اور اس خطے میں حاصل کرنا چاہتا ہے، دہشت گردی کے اس معاملے کو اپنے ایک بڑے منصوبے کے تحت استعمال کیا ہے۔ جناب والا! ہم نے ۹/۱۱ کے واقعہ کی مذمت کی ہے۔ اسی طرح دنیا بھر کی اسلامی تنظیموں کے نمائندوں نے واضح طور پر اس افسوسناک واقعہ کی مذمت کی ہے لیکن جس طرح امریکہ نے اس واقعہ کو فوجی مداخلت اور جنگیں شروع کرنے کے لیے استعمال کیا ہے وہ قابل مذمت ہے۔ اس کے نتیجے میں امریکہ نے پوری دنیا کو دہشت زدہ کیا ہے اور عدم تحفظ کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ بین الاقوامی ہوں یا ملکی قوانین، حب الوطنی کے نام پر ان قوانین کی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف قوانین کے نام پر انسانی حقوق اور آج تک کی جو انسانی اقدار تھیں انہیں اس نام نہاد جنگ میں جس بری طرح پامال کیا گیا ہے وہ ایک بڑی اندوہناک کہانی ہے۔

ہم اس نام نہاد جنگ میں جس طرح امریکہ کے آلہ کار بن گئے ہیں اور ہم نے اس کو آگے بڑھایا ہے یہ مسلمانوں اور اسلام کے خلاف جنگ میں شریک ہونے کے مترادف ہے۔ ہم نے اس میں شرکت کر کے جو ہمارے دوست تھے ان کو دشمن بنالیا ہے اور جہاں امن تھا وہاں فساد اور خونریزی کا راستہ کھول دیا ہے۔ جنرل پرویز مشرف نے اگرچہ ۲۰۰۱ء سے ہی

امریکہ کو تعاون دے دیا تھا لیکن ۲۰۰۳ء کے بعد سے خاص طور پر جس طریقے سے انہوں نے کام کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس پر دوبارہ غور، نظر ثانی اور پالیسی کی تشکیل نو کیے بغیر ہمیں اپنے مقاصد حاصل نہیں ہوسکتے۔ میں یہ بات صاف کہنا چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں دنیا کے عوام اور پاکستانی عوام ماضی کی پالیسیوں کا تسلسل نہیں تبدیلی چاہتے ہیں۔

جناب والا! مجھے اجازت دیجیے کہ اس سلسلہ میں خود امریکہ کے بارے میں ایک بہت ہی ممتاز ماہر اقتصادیات ڈاکٹر ایلن بی۔ کروگیر کی تحقیق آپ کے سامنے پیش کروں۔ ''ایک دہشت گرد کیسے بنتا ہے: معیشت اور دہشت گردی کی بنیادیں'' کے حوالہ سے اس تحقیق میں اس نے باقاعدہ اس بات کا مطالعہ کیا ہے کہ خود امریکہ میں دہشت گردی سے اموات اور دیگر ذرائع سے حقیقی خطرات کیا ہیں۔ یہ بڑا دلچسپ موازنہ ہے وہ بتاتا ہے کہ زندگیوں کو سب سے زیادہ خطرہ دل کے امراض سے ہے۔ ہر ۳۰۰ اموات میں سے ایک موت کا چانس امراض قلب سے ہے، پھر کینسر، نمونیہ وغیرہ وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ دہشت گردی اور خودکشی کا نمبر کہاں آتا ہے۔ مطالعہ کے مطابق ۵۰ لاکھ ۲۹ ہزار افراد میں سے ایک کے مرنے کا خطرہ ہے۔ آپ دیکھیے کہ اس کے باوجود کس طرح خود امریکہ نے دہشت گردی ختم کرنے کے نام پر دنیا کو اپنی نفرت میں جھونک دیا ہے۔ سرکاری طور پر اس وقت صرف عراق میں ۶۰۰ بلین اور افغانستان میں ۲۰۰ بلین ڈالرز خرچ کیے جاچکے ہیں۔ نوبل انعام یافتہ اسٹگلیٹز (Joseph E. Stiglitz) کی تحقیق کے مطابق اس نام نہاد جنگ کی قیمت پچھلے سات سال میں امریکہ کی معیشت میں ۲ ٹریلین ڈالر اور پوری دنیا میں ۳ ٹریلین ڈالر ہو چکی ہے۔ اس پر مزید یہ تباہی مچائی گئی ہے کہ پالیسیوں کے حوالہ سے جو اصل ایشوز تھے انہیں نظر انداز کر کے محض 'اسلام اور مسلم دہشت گردی' کے افسانے تشکیل کر کے، یہ کام کیا جارہا ہے۔ ایک اور معروف پروفیسر کروگیر (Professor Krueger) اس بات کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے، وہ یہ کہتا ہے:

''مجھے یقین ہے کہ مغرب کے لیے یہ سمجھنے میں ناکامی، کہ ہماری پالیسیاں منفی یا حتّٰی

کہ پر تشدد نتائج کا باعث بن سکتی ہیں، نقصان دہ ہے۔"

اصل مسئلہ آپ کی پالیسیوں کا ہے، لیکن آپ نے اس کو اسلام، مسلمان اور مدرسہ سے متعلق مسئلہ بنا دیا ہے۔ اور پھر اسی کے ساتھ تالیاں بجاتے ہوئے آپ امریکہ کے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔ یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے۔

رائے عامہ کے جائزے کیا کہتے ہیں: جناب والا! میں انٹرنیشنل ریپبلکن انسٹی ٹیوٹ (IRI) کا سروے (جو ۱۹ تا ۲۹ جنوری ۲۰۰۸ء کو منعقد ہوا) بھی آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ایک امریکی ادارہ ہے۔ چنانچہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سروے امریکہ نے ہی کروایا ہے۔ پاکستانی عوام کیا چاہتے ہیں، اس بارے میں ان کا تجزیہ آپ سن لیجیے۔ جب پاکستانیوں سے سوال کیا گیا کہ آپ کی نگاہ میں آپ کے ووٹ دینے کے لیے، آپ کے جو مسائل ہیں ان میں سب سے اہم مسئلہ کیا ہے، یعنی ملک کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ تو ان میں پہلا ۵۵ فیصد افراط زر، اس کے بعد بے روزگاری ۱۵ فیصد اور دیگر مسائل آتے ہیں۔ صرف ۱۲ فیصد نے یہ کہا کہ دہشت گردی بھی مسئلہ ہے۔ یہ اس مسئلے کے بارے میں عوام کے احساسات ہیں جبکہ آپ نے اس کو ہر معاملہ سے الگ کر کے پورے ملک کی قسمت کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ اور آگے بڑھیے.....

یہ بڑا اہم موضوع ہے۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ:

آپ کی کیا رائے ہے کہ کیا پاکستان کو امریکہ سے اس کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں تعاون کرنا چاہیے؟

بڑا واضح سوال ہے۔ لیکن آپ دیکھیے کہ پاکستانی عوام کا کیا فیصلہ ہے۔ صرف ۹ فیصد کہتے ہیں کہ تعاون کیجیے۔ ہر دس میں سے نو یعنی ۸۹ فیصد کہتے ہیں کہ تعاون نہ کریں وہ کُلی طور پر امریکہ سے تعاون کے لیے منع کرتے ہیں، یہ ہے پاکستانی عوام کا فیصلہ۔ باقی دنیا کو آپ دیکھیے، یہ عالمی رائے عامہ کا سروے فروری ۲۰۰۷ء کا ہے۔ اس میں بھی یہی سوال کیا گیا

ہے۔ جواباً دنیا کی آبادی کا ۲۷ فیصد یہ کہتا ہے کہ ہمیں اصل خطرہ امریکہ سے ہے، دہشت گردی سے نہیں۔ امریکہ اصل خطرہ ہے۔

ایک اور سوال اس مذکورہ بالا سروے فروری ۲۰۰۷ء میں پاکستان کے بارے میں آیا ہے۔ سوال یہ تھا:

آپ کا کیا خیال ہے کہ فوجی و سلامتی کے معاملات پر پاکستان اور امریکہ کے درمیان گزشتہ چند برسوں سے جو تعاون ہو رہا ہے اس سے زیادہ تر پاکستان کو فائدہ پہنچا یا امریکہ کو، یا دونوں کو؟

جناب والا! صرف ۶ فیصدی کا خیال یہ ہے کہ پاکستان کو فائدہ پہنچا ہے، ۴۴ فیصدی کی رائے یہ ہے کہ پاکستان کو فائدہ نہیں پہنچا صرف امریکہ کو فائدہ پہنچا ہے۔ ۱۲ فیصد کا خیال یہ ہے کہ دونوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

اگر آپ Pew Research Center کے Global Attitude Survey کو دیکھیں تو اس میں بھی صاف کہا گیا ہے، سوال تھا:

براہ کرم مجھے بتائیں کہ امریکہ کے بارے میں آپ کی رائے کتنی موافق ہے، کس قدر ناموافق ہے، یا بہت زیادہ موافق ہے؟

پاکستان میں ۶۸ فیصد نے کہا ہے کہ وہ امریکہ کے حامی نہیں۔

پوچھا گیا کہ:

کون سا جواب آپ کے نقطہ نظر سے قریب ہے۔ میں امریکی قیادت میں دہشت گردی سے لڑنے کی کوششوں کا حامی ہوں یا میں امریکی قیادت میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کا مخالف ہوں۔

جناب والا! اس سوال کے جواب میں خود امریکہ میں ۲۳ فیصد لوگوں نے کہا ہے کہ

یہ جنگ غلط ہے۔ لیکن اگر آپ پاکستانیوں اور مسلم ممالک کو دیکھیں، ہر جگہ کے لوگوں نے یہ کہا ہے کہ ہم ہر گز اس کے حق میں نہیں ہیں۔ پاکستان میں ۶۰ فیصد نے کہا ہے کہ یہ جنگ غلط ہے، ہم اس میں تعاون نہیں کرنا چاہتے۔ بش کی پسندیدگی، ناپسندیدگی کے بارے میں بھی بعینہ یہی معاملہ ساری دنیا کا ہے۔ میرے پاس اور بھی مواد ہے لیکن میں وقت کی کمی کی بنا پر اسے پیش نہیں کر رہا۔

امریکہ کے ساتھ رویہ: جناب والا! جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ دہشت گردی کے خلاف یہ جنگ ایک بدنام جنگ ہی نہیں، ایک بے معنی چیز ہے۔ جنگ ہوتی ہے کسی خاص مقصد کے لیے لیکن یہ ایک غیر واضح، بے معنی اور مبہم چیز ہے۔ یہ جو کہا گیا کہ ہم دہشت گردوں کو تباہ کر دیں گے یا فوجی طاقت سے ختم کریں گے، اس سے بڑی غلط بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا ایک بحران میں آگئی ہے۔ دہشت گردی کا خاتمہ اگر ہو سکتا ہے تو وہ قوت سے نہیں ہو سکتا، وہ مذاکرات سے ہو گا۔ ان مسائل کو سلجھانا ہو گا جن کی بنا پر یہ رویہ رونما ہوتا ہے۔ مذاکرات وہ طریقہ ہے جس سے آپ دوسروں کو غلط راستوں سے نکال کر صحیح راستوں کی طرف لا سکتے ہیں اور اس ضمن میں شکایتیں اور ناانصافیاں زیر بحث لانا ہوں گی۔ جب تک وجوہات، یعنی مثلاً ناجائز قبضہ ختم نہیں ہو گا اس کے خلاف مزاحمت جاری رہے گی۔ چنانچہ مسئلہ مزاحمت نہیں، مسئلہ قبضہ ہے۔ امریکہ نے مسئلے کو غلط بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مسئلہ مزاحمت ہے۔ ہم کہتے ہیں نہیں، آپ کا قبضہ، آپ کی جانب سے ظلم اور ناانصافی اور آپ کی پالیسیاں مسئلہ ہیں۔

اس لیے جب تک حقیقی مسئلہ پر توجہ نہیں ہو گی، اس وقت تک آپ اس دلدل سے نہیں نکل سکتے۔ چنانچہ آپ سے میری سب سے پہلی درخواست یہی ہے کہ خدا کے لیے ایماندارانہ اور معروضی جائزہ لیجیے، سارے حقائق کو سامنے رکھ کر لیجیے اور امریکہ کے بارے میں رویہ بدلیے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ امریکہ سے آپ قطع تعلق کر لیجیے۔ ہر گز نہیں۔ وہ سپر پاور اور ایک اہم ملک ہے۔ اور خارجہ پالیسی کا تقاضا ہے کہ اس سے ہمارے تعلقات

ہونے چاہییں۔ لیکن آج عالم یہ ہے کہ ہماری قسمت کے فیصلے واشنگٹن میں ہو رہے ہیں۔ واشنگٹن کے لوگ پاکستان کی سرزمین پر آکر ہمیں حکم دے رہے ہیں یہ قابل قبول نہیں ہے۔

جناب والا! امریکی فضائیہ اور نیٹو افواج نے پچھلے دو سال میں ۳۷ مرتبہ ہماری سرحدوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ جواباً کبھی ہم خاموش رہے ہیں، کبھی ہم نے بڑے ادب سے احتجاج کیا اور کبھی ہم نے آگے بڑھ کر اسے خود اوڑھ لیا کہ حضور یہ آپ نے نہیں، ہم ہی نے اپنے اوپر حملہ کیا ہے۔ یہ افسوسناک اور شرمناک معاملہ ختم ہونا چاہیے۔ وقت آگیا ہے کہ امریکہ سے صاف کہہ دیا جائے اور یہ صرف کہنے کی بات نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے پورا سیاسی عزم ہونا چاہیے کہ پاکستانی سرحدوں کی خلاف ورزی کے معنی پاکستان کے خلاف جنگ ہے اور پاکستانی فوج اور عوام اس کا جواب دیں گے۔ درحقیقت یہی واحد اور باعزت راستہ ہے ورنہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ابھی حال ہی میں سینئر امریکی سفارت کار نیگرو پونٹے (John D. Negroponte) نے کیا کہا ہے؟ اس نے کہا ہے کہ "اگر ہم اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیابی کا امکان دیکھیں گے تو ہم پاکستان میں براہ راست مداخلت کریں گے۔ خواہ پاکستان اس کی اجازت دے یا نہ دے۔ اور خواہ اس کی قیمت پاکستان کا عدم استحکام ہو"۔ یہ ان کے عزائم ہیں۔ جناب والا! جب تک کہ ہم اپنا رویہ نہیں بدلتے، امریکہ سے معاملات بہتر نہیں ہوسکتے۔ امریکہ سے معاملات کیجیے لیکن عزت اور وقار کے ساتھ۔

ہندوستان سے تعلقات: جناب والا! میری نگاہ میں خارجہ پالیسی کے معاملات میں اگلا مسئلہ ہندوستان سے تعلقات ہیں۔ اصولاً کسی بھی دوسرے ملک کی طرح ہندوستان سے ہمارے تعلقات دوستانہ ہونے چاہییں۔ لیکن جو بنیادی، اصولی، انسانی اور سیاسی مسائل ہیں جن پر پاکستان کے سیاسی اور معاشی مستقبل کا بھی انحصار ہے، اگر ان کو نظر انداز کر کے یہ کام کیا گیا تو یہ پاکستان کے ساتھ دشمنی ہوگی اور قوم اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔

بھارت کے ساتھ تعلقات کے ضمن میں کشمیر کا مسئلہ ہمارے لیے محض سرحدی

معاملہ نہیں۔ اس پر پاکستان کی تکمیل اور مستقبل کا انحصار ہے۔ یہ ڈیڑھ کروڑ انسانوں کے حق خود ارادیت کا مسئلہ ہے۔ ہم انسانی حقوق اور قوموں کو رائے شماری کا حق دینے کی باتیں کرتے ہیں لیکن جس چیز کے اوپر ہم ہی نہیں خود بھارت اور اقوام عالم گواہ ہیں، جس پر اقوام متحدہ کی قرار دادیں موجود ہیں، اس کو نظر انداز کر کے اعتماد کی بحالی کے اقدامات (CBMs) کے نام پر جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ خود اپنے مؤقف کی نفی ہے۔ آپ نے دیکھ لیا، تین سال سے آپ مذاکرات کے میدان میں کیا جھک مار رہے ہیں اور اس سے اب تک کیا حاصل ہوا ہے۔ آپ نے ان لوگوں کو جو اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور قربانیاں دے رہے ہیں مایوس کیا ہے۔ پانچ لاکھ افراد آزادی کے لیے اور اپنے حق کے حصول کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں اور وہ اب بھی اپنی جدوجہد ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ کشمیر کی جدوجہد آزادی کی حمایت وہ پالیسی ہے جو قائداعظم نے بنائی تھی۔ یہ وہ پالیسی ہے جس کے اوپر پورے ملک میں اصولی اتفاق رائے ہمیشہ رہا ہے۔ آپ نے یک طرفہ انداز میں، اصولی و تاریخی پس منظر کو نظر انداز کر کے حل تلاش کرنے کے شوق میں ایسا راستہ اختیار کیا جس سے آپ نے اس قومی معاملے کو اور اس سے متعلق پالیسی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

میں وزیر خارجہ اور موجودہ حکومت سے کہوں گا کہ خدا کے لیے ہوش کے ناخن لیجیے اور جو ہمارا اصولی مؤقف ہے اس پر آیئے۔ ہندوستان سے ہم دوستی بھی چاہتے ہیں اور تجارت اور ثقافتی تعلقات بھی، لیکن پاکستان کا قیام کچھ خاص مقاصد سے ہوا ہے۔ ہماری بھی پچھلی ایک تاریخ ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم کس سے معاملہ کر رہے ہیں اور وہ ماضی میں ہمارے ساتھ کیا کیا وعدہ خلافیاں کرتے رہے ہیں۔ اس پورے زمانے میں جو کچھ اعتماد کی بحالی کے اقدامات کے نام پر انہوں نے کیا ہے اگر اس پر بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلتی ہیں تو پھر کب کھلیں گی۔

مشرق وسطیٰ پر ہمارا طرز عمل: جناب والا! خارجہ پالیسی کے ضمن میں یہ بات بھی میں کہنا

چاہتا ہوں کہ مشرق وسطیٰ ہمارے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن مشرف حکومت نے اسرائیل کے ساتھ تعلقات کا دروازہ کھول کر اور امریکہ کی خوشنودی اور اسرائیلی لابی سے اپنے فائدے حاصل کرنے کے لیے جو کام کیا ہے وہ امت مسلمہ کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کے مترادف ہے۔ اس پالیسی پر بھی نظر ثانی کیجیے۔ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ اس کے نتیجے کے طور پر پوری عرب دنیا میں، وہ جو پاکستان سے محبت کرتے تھے اور پاکستان کے دکھ درد میں برابر کے شریک تھے، ان کو کتنا دکھ ہوا ہے، کتنا دھچکا لگا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مسلم حکمران اس پر آپ کی تائید و تحسین کر سکتے ہیں لیکن یہ لوگ جو اسلامی ممالک کے اندر مغربی مفادات کے محافظ بنے ہوئے ہیں، قوم اور امت کی نمائندگی نہیں کرتے۔ انہیں امت نہ سمجھیے، انہیں آپ اصل سیاسی قوت بھی نہ سمجھیے، اصل سیاسی قوت مسلم عوام ہیں، امت مسلمہ ہے اس کے جذبات، احساسات اور اس کی توقعات آپ کے سامنے ہونی چاہییں۔

افغانستان اور پاکستان: جناب والا! میں مختصراً یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ افغانستان کے بارے میں بھی ہماری جو پالیسی ہے اس پر بہت سنجیدہ غور و فکر اور مشاورت کے بعد نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ افغانستان سے ہمارے تعلقات دین، تاریخ، زبان، جغرافیہ، معیشت و معاشرت اور تہذیب و تمدن، ان سب بنیادوں پر ہیں۔ لیکن یہ عسکری و تزویراتی گہرائی اور چھپ چھپا کر جوڑ توڑ کرنے کی کوشش اور اپنے لیے 'مفید' افراد اور 'مخالف' افراد کا جو کھیل کھیلا گیا، یہ بڑا خطرناک رہا ہے۔ ہمیں اس سے بھی پیچھے ہٹنا چاہیے۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ افغانستان کے سارے لوگ، ان کی قیادت اور جو کچھ تعلقات اسّی کی دہائی میں ہمارے اور ان کے درمیان پیدا ہوئے تھے، ہم نے ان کو گنوا دیا ہے۔ کابل میں اور کچھ اہم مقامات پر پاکستان کے لیے پہلے جو محبت اور عزت تھی وہ بہت متاثر ہوئی ہے۔ اس کے مقابلے میں بھارت نے وہاں اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اقدامات سے ہمارے لیے نئے خطرات پیدا کیے ہیں۔ اس تناظر میں افغانستان کے بارے میں بھی پوری کی پوری پالیسی نظر ثانی چاہتی ہے۔

چین کے ساتھ روابط: آخر میں بہت ہی نازک مسئلہ ہے لیکن میں اس پر بات کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ چین سے ہمارے تعلقات ہیں۔ چین ہمارا بہترین دوست رہا ہے۔ ہمارے باہم تعلقات بین الاقوامی تعلقات کا اس اعتبار سے ایک نیا ماڈل ہیں کہ ہمارے نظریات مختلف ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے درمیان نہ صرف باہم تعاون رہا ہے بلکہ یہ تعاون اخلاص اور اعتبار اور دیرپا اور ہمیشہ رہنے والے تعلقات کا نمونہ ہے جس میں دونوں ملکوں کے تزویراتی مفادات بھی شامل ہیں۔

مجھے چین کی قیادت سے براہ راست معاملات کرنے کا موقع ملا ہے۔ الحمدللہ دیگر لوگوں کے علاوہ میری ملاقاتیں ڈیفنس کمیٹی کے چیئرمین سے بھی ہوئی ہیں۔ میں آپ سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ وہاں نیک خواہشات کا ڈھیر موجود ہے لیکن اس کے ساتھ ہی نئے رجحانات اور نئے چیلنجز بھی ہیں۔ چنانچہ اگر ہم نے محض ماضی پر نگاہ ڈال کر حال کے زمینی حقائق کو نظر انداز کیا تو یہ ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔ چین کی دوستی ہمارے لیے ضروری ہے اور ہماری دوستی چین کے لیے ضروری ہے لیکن اس کے لیے آپ کو کچھ نئی سوچ لانا پڑے گی۔ یہ باتیں کہ ہمارے تعلقات ہمالیہ سے بلند اور سمندروں سے گہرے ہیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن زمینی حقائق یہ ہیں کہ جتنے معاہدے آپ نے کیے ہیں ان میں سے ۵۰ فیصد سے بھی زیادہ پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ دوسری جانب جب تک سرکاری سطح کے ساتھ ساتھ عوام اور اداروں کی سطح پر اور اسی طرح میڈیا اور پھر تجارت کی سطح پر مشترکہ پیداوار اور مشترکہ مفاد کی بنیاد پر تعلقات کو وسعت نہیں ملتی نئے رجحانات کی پیچیدگیوں سے نمٹنا مشکل ہوگا۔ اس تناظر میں ہمیں بڑے گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

خارجہ پالیسی کا تسلسل؟

دفتر خارجہ کی بڑی ذمہ داری ہے کہ جن دائروں کی میں نے نشاندہی کی ہے ان کے بارے میں وہ سوچ و بچار کریں۔ خدا کے لیے تسلسل کے چکر میں نہ پڑیں۔ اپنے نئے وزیراعظم اور وزیر خارجہ سے میں نے جو الفاظ سنے ہیں کہ دہشت گردی کی جنگ امریکہ کی

نہیں ہماری جنگ ہے اور ہم اسے اپنے انداز میں لڑیں گے، یہ صدر بش کی آواز کی بازگشت ہے۔ خدا کے لیے اس چکر سے نکلیے۔ دہشت گردی کیا ہے، پہلے اسے متعین کیجیے، کس کو خطرہ ہے اور کس چیز سے ہے اس کو متعین کیجیے۔ ٹھیک ہے جہاں پر تشدد کے مسائل ہیں ہمیں ان مسائل کو بھی حل کرنا ہے، لیکن میں آپ سے صاف کہنا چاہتا ہوں کہ اپنی غلط پالیسیوں، غلط ترجیحات اور محض قوت کے استعمال سے مسائل کو حل کرنے کی سوچ کے نتیجہ میں ہم نے یہاں پر مسائل پیدا کیے ہیں۔

جناب والا! اگر میں چلتے چلتے یہ بھی کہہ دوں کہ میری نگاہ میں خودکش حملہ غلط چیز ہے لیکن اس بات کو سمجھنے اور تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے کہ جس طریقے سے خودکش حملوں کے واقعات پاکستان میں ہوئے، ماضی میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ یہ مسئلہ صدر بش کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہماری شراکت کے بعد کی پیداوار ہے۔ گہرائی میں جاکر سارے واقعات کا تجزیہ کیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ پہلے ان حملوں کا ہدف غیر ملکی حکومت تھی پھر ان کا ہدف ہر وہ شخص ہوا جو ان کی نگاہ میں غیر ملکی حکومت کی پالیسی کو یہاں پر فروغ دے رہا ہے۔ پھر ان کا ہدف فوج بنی جو اس جنگ میں جھونک دی گئی تھی لیکن ان کی نگاہ میں اس غیر ملکی فوج کا حصہ بن گئی جس کے خلاف وہ سرگرم ہیں۔ اس کے بعد پھر خاص طور سے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے واقعات نے تو ردعمل کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔

درحقیقت اس پاگل پن میں ایک پیغام ہے اس کا تجزیہ کیجیے، متعین کیجیے کہ کیا وجوہات ہیں تب ہی آپ اس مسئلہ کو حل کر سکیں گے۔ محض یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ ہم اپنے انداز میں یہ جنگ لڑیں گے۔ درحقیقت یہ جنگ ہماری جنگ نہیں ہے۔ دوسروں کی جنگ کو اپنے اوپر لے کر، خدا کے لیے اس ملک کو مصیبت میں نہ ڈالیں۔ سوچیے، نظرثانی کیجیے اور نئی پالیسیاں لائیے۔ پالیسیاں پارلیمنٹ میں بنائیے، قوم کو اعتماد میں لیجیے۔ اگر قوم کی امنگوں کے مطابق آپ کی پالیسی نہیں ہوگی تو اسے قوم کی تائید حاصل نہ ہوگی اور یوں آپ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ (۵ مئی ۲۰۰۸ء)

۹/۱۱ کے بعد امریکہ کے ساتھ تعاون کی پالیسی

اگست ۲۰۰۷ء میں امریکی صدارتی انتخابات میں نامزدگی کے حصول کے لیے جاری مہم کے دوران کولاریڈو سے تعلق رکھنے والے ریپبلکن امیدوار ٹام ٹین کریڈو (Tom Tancredo) نے اپنے بیانات میں نہ صرف پاکستان پر فوجی حملوں کی دھمکیاں دیں بلکہ دہشت گردوں کی جانب سے جوہری حملہ کی صورت میں مکہ اور مدینہ پر بمباری کرنے کی دھمکی دی۔ ان دھمکیوں پر پورے عالم اسلام بشمول پاکستان میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ سینیٹ آف پاکستان میں پاک امریکہ تعلقات اور خارجہ پالیسی پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اس موقع پر مختلف سینیٹرز کے علاوہ ڈاکٹر شیر افگن نیازی وزیر پارلیمانی امور، نے گفتگو کی۔ تقاریر میں پاکستان امریکہ تعلقات، خطہ کی صورت حال، دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ اور پاکستان کا کردار اور امریکی صدارتی انتخابی مہم کے دوران امیدواروں کی تقریروں میں پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز بیانات پر تبصرے کیے گئے، پاکستان، افغانستان، ایران تعلقات اور عالم اسلام کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔

پروفیسر خورشید احمد نے اسی حوالہ سے ڈاکٹر شیر افگن کے خیالات کی تحسین کی۔ تاہم اپنی تقریر میں انہوں نے زیادہ وسیع تر تناظر میں معاملات اور موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے زیر نظر تحریر میں پاکستان امریکہ تعلقات کی تاریخ اور دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ میں اتحادی بن کر پاکستان نے کیا کھویا اور کیا پایا، نیز امریکی خارجہ پالیسی میں پاکستان کی بھارت کے مقابلے میں کیا حیثیت ہے جیسے کئی چبھتے سوالات کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔

جناب چیئرمین! میں وزیر پارلیمانی امور جناب شیر افگن صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی تقریر میں جن نکات پر روشنی ڈالی اور جس مؤقف کا اظہار کیا، وہ بہت بروقت اور مؤثر ہے۔ ذاتی طور پر سینیٹ کی گزشتہ سولہ سترہ سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ میں ان کی

باتوں سے نوّے فیصدی اتفاق محسوس کر رہا ہوں۔ میں ذاتی بات کبھی نہیں کیا کرتا لیکن آج مجھے یہ کہنے کا موقع دیں کہ ۲۰۰۲ء میں قائم ہونے والی اسمبلی کے پانچ سالہ دور کے اختتام اور ۲۰ جولائی ۲۰۰۷ء کے بعد[1] جو سیاسی فضا ملک میں ہے اس میں ان کی یہ تقریر شاید ہوا کے ایک نئے رُخ کی اطلاع دے رہی ہے۔ اس موقع پر مجھے وہ دن یاد آرہا ہے جب اکتوبر ۲۰۰۲ء میں قومی اسمبلی میں ۱۹۷۳ء کے دستور کو ہاتھ میں لے کر انہوں نے کچھ اعلانات کیے تھے۔ آج کی تقریر اور اس اعلان میں مجھے بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ یہ تقریر جہاں امریکہ کے اصل چہرے کو اور پاکستان کے سلسلے میں اس کے رویے کو صاف الفاظ میں بیان کرتی ہے وہیں جنرل پرویز مشرف نے جو پالیسیاں امریکہ کے بارے میں اختیار کی ہیں اور خصوصیت سے ۹/۱۱ کے بعد جو یوٹرن لیا گیا ہے اور جس طرح امریکہ کی وفاداری امریکیوں سے زیادہ ہمارے حکمران کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کے اوپر ایک فرد جرم اور مؤثر تنقید ہے۔ اس کا مخاطب صرف امریکہ نہیں، ایوان صدر بھی ہے۔ کیونکہ پاکستان کی خارجہ پالیسی دفتر خارجہ سے کہیں زیادہ ایوان صدر سے بن رہی ہے اور پارلیمنٹ کا تو اس میں کوئی دخل ہے ہی نہیں۔ میں ان کے بیان کیے گئے نکات[2]

---

[1] ۲۰ جولائی ۲۰۰۷ء، جامعہ حفصہ لال مسجد اسلام آباد کے طلباء وطالبات کے خلاف اس وقت کی حکومت کی جانب سے فوجی آپریشن کیا گیا۔

[2] جولائی ۲۰۰۷ء میں امریکی صدارت کے امیدوار، باراک اوباما اور ریپبلکن امیدوار ٹام ٹینن کریڈو (Tom Tancredo) نے انتخابی مہم کے دوران اپنی تقاریر میں پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف دھمکی آمیز بیانات دیے۔ سینیٹ آف پاکستان میں اس حوالہ سے پاک امریکہ تعلقات پر بحث کی ابتدا ڈاکٹر شیر افگن نیازی کی تقریر سے ہوئی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں امریکی صدارتی امیدواروں کے بیانات کو مندرجہ ذیل چار اہم نکات میں سمیٹ کر بیان کیا:

۱۔ امریکہ میں پینٹاگان کے دفاتر پر اگر دہشت گردوں کی جانب سے ایٹمی حملہ ہوا تو مکہ اور مدینہ پر بمباری کی جائے گی۔

۲۔ پاکستان کی جانب سے افغانستان کی سرحدی خلاف ورزیوں اور دہشت گردوں کی کارروائیاں جاری رہنے پر امریکہ پاکستان میں فوجی مداخلت کرے گا۔

۳۔ ماضی میں پاکستان اور بھارت کے ساتھ تعلقات کی برابری کی بنیاد پر مبنی پالیسی سے ہٹ کر امریکہ بھارت کے ساتھ سول نیوکلیئر ٹیکنالوجی کا معاہدہ کرے گا۔

۴۔ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ میں امریکہ کا اتحادی اور فرنٹ لائن اسٹیٹ ہونے کے باوجود، پاکستان کو امریکی امداد جاری رکھنے کے لیے شرائط پر مبنی قانون سازی پریسلر ترمیم کی طرح کی جائے گی۔

سے اتفاق کا اظہار کرتے ہوئے ان پہلوؤں کو سامنے لاؤں گا جن سے اصل حقائق کو سمجھنے میں مدد ملے۔

خارجہ پالیسی کے چار ستون

جناب چیئرمین! کسی ملک کی خارجہ پالیسی کے چار ستون ہوتے ہیں۔ پہلا اس ملک کی سلامتی، آزادی، سیکورٹی اور اس پہلو سے اس کے تزویراتی مفادات۔ واضح رہنا چاہیے کہ مفاد کا تحفظ کوئی بری چیز نہیں ہے۔ مفاد صحیح ہونا چاہیے اور اس میں آزادی، خود مختاری اور سلامتی سب سے پہلے آتی ہے۔ یہاں میں یہ بھی واضح کر دوں کہ سیکورٹی کے معنی محض فوجی سلامتی نہیں بلکہ فوجی سیکورٹی کے ساتھ ساتھ سیاسی و معاشی سلامتی بھی ہے اور آج پوری دنیا میں اس بات کا اعتراف کیا جا رہا ہے کہ انسانی سلامتی کی یہ چار اہم جہتیں ہیں۔

دوسری چیز ملک کے نظریات، اصول اور اس کی اقدار کا تحفظ ہے۔ تیسری چیز اس کی جغرافیائی پوزیشن ہے کیونکہ کوئی خارجہ پالیسی جغرافیائی حقائق کو نظر انداز کر کے نہیں بنائی جا سکتی۔ جغرافیائی ماحول دوستانہ ہونا چاہیے۔ اس لیے جو بھی آپ کے پڑوسی ہیں وہ آپ کی خارجہ پالیسی بنانے میں ایک کلیدی کردار ادا کریں گے۔ اس تسلسل میں آخری چیز تاریخ ہے۔ یہ چار عوامل ہیں جن پر خارجہ پالیسی بنتی ہے۔

امریکہ سے تعلقات

اس موقع پر میں صرف امریکہ اور پاکستان کے تعلقات پر اپنی بات کو محدود رکھوں گا۔ اس لیے کہ اس وقت پوری خارجہ پالیسی زیر بحث نہیں بلکہ اس کا صرف یہی پہلو ہمارے سامنے ہے۔ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں اور میرے خیال میں شیر افگن صاحب کی تقریر کا بھی خلاصہ یہی ہے کہ امریکہ کے بارے میں جو پالیسی ہم نے اختیار کی ہے اور جس پر ہم عمل بھی کر رہے ہیں اور دوسری جانب امریکہ نے جو رویہ ہمارے ساتھ اختیار کیا اس کا اولین اور لازمی تقاضہ یہ ہے کہ امریکہ کے ساتھ خارجہ تعلقات کے پورے نظام پر نظر ثانی کی جائے۔

جس راستے پر ہم چل رہے ہیں وہ راستہ غلط ہے۔ اس سے ہم نہ صرف نقصان اٹھا رہے ہیں بلکہ ہمارے تزویراتی مفادات بھی شدید طور پر متاثر ہو رہے ہیں۔ اس پالیسی سے ہم نے اپنے پڑوسی، جو ہمارے حلیف اور ساتھی تھے ان کو اپنا دشمن بنالیا ہے یا ان سے دوری پیدا ہو رہی ہے۔ یہ ہمارے نظریات اور ہماری اقدار کے خلاف ہے اور یہ ہماری تاریخ اور ہماری روایات سے متصادم ہے۔ اس لیے پیغام یہ ہے کہ یہ وقت ہے کہ ہم اپنی پالیسی پر نظر ثانی کر کے اسے تبدیل کریں۔ میری معروضات کا یہ ایک پیغام ہو گا۔

تاریخی تناظر: میں یہاں یہ بات بھی کروں گا کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد امریکہ سے تعلقات کو مضبوط کرنے اور دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی گئی جو اصولی طور پر بالکل صحیح تھی۔ اگرچہ خان لیاقت علی خان کے اس اقدام سے مجھے اختلاف ہے کہ اس کے لیے انہوں نے روس کی دعوت کو ترک کر کے امریکہ جا کر ایک غلط راستہ اختیار کیا۔ تاہم اس پہلو سے قطع نظر امریکہ کے بارے میں ہماری خارجہ پالیسی کیا ہونی چاہیے، اس کو قائداعظمؒ نے اپنے دو بیانات میں واضح کیا ہے۔ پہلا بیان ان کا وہ پیغام ہے جو انہوں نے امریکی قوم کو دیا ہے اور دوسرا ان کی وہ تقریر ہے جو نامزد امریکی سفیر کی جانب سے سفارت کے کاغذات پیش کرنے کے موقع پر انہوں نے کی ہے۔ قائداعظم نے صاف طور پر کہا کہ ہم ایک اسلامی ریاست ہیں۔ ہم آپ سے دوستانہ تعلقات چاہتے ہیں لیکن یہ دوستانہ تعلقات برابری اور ان عالمی اصولوں کی بنیاد پر ہوں گے جن کو اقوام متحدہ کے چارٹر نے قبول کیا ہے۔ وہ اصول جن کی بنیاد پر اقوام کے درمیان عزت اور حمیت کے ساتھ مفادات کے تحفظ کے لیے تعلقات استوار کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح لیاقت علی خان کی تقاریر بھی پڑھ لیجیے۔ میں انہیں خراج تحسین پیش کروں گا کہ انہوں نے امریکہ کے دورے کے دوران کی گئی تقاریر کے اندر پاکستان کے ویژن، پاکستان کے مقام اور پاکستان کی خارجہ پالیسی کے خطوط کار کو پوری دیانت اور جرأت کے ساتھ پیش کیا۔ جب ان سے بیرونی امداد کی بات ہوئی تو انہوں نے صاف کہا کہ بین الاقوامی تعاون ایک اچھی چیز ہے، ہم اس کے لیے تیار ہیں لیکن اپنی

آزادی، نظریات اور اپنی اقدار کی قیمت پر نہیں۔ ان کے الفاظ تھے کہ ہمارا ایمان بیچنے کی چیز نہیں ہے۔ تو جناب والا! امریکہ سے تعلقات کی یہ بنیاد تھی۔

۹/۱۱ کے بعد کی خارجہ پالیسی: آج کیا صورتحال ہے؟ میں بڑے دکھ سے لیکن پوری دیانت سے یہ بات کہتا ہوں کہ خصوصیت سے ۹/۱۱ کے بعد سے آج تک امریکہ کے ساتھ ہمارے تعلقات خوف، دھمکی، سرد مہری، جبر اور بلیک میلنگ اور پریشر کی بنیاد پر ہیں۔ یہ بات میں کسی جذباتی انداز میں یا سیاسی بنیاد پر نہیں بلکہ حقائق کو پیش نظر رکھ کر کہہ رہا ہوں۔

امریکی سوچ اور ہماری خواہشات: جناب والا! امریکہ نے ۹/۱۱ کے بعد جو پالیسی بنائی ہے اسے سمجھنے کے لیے میں چند ضروری چیزیں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ باب وڈورڈ (Bob Woodward) نے صدر بش کے درج ذیل الفاظ اپنی کتاب (Bush at War) میں نقل کیے ہیں جو اس وقت کی امریکی پالیسی کا بنیادی اصول پیش کرتے ہیں۔

> ہم اپنی عظیم قوم کے دفاع میں دنیا کی چاروں سمتوں میں موت اور تشدد برآمد کریں گے۔ [باب وڈورڈ، Bush at War، ص ۳۵۲]

یہ امریکہ کی پالیسی کا بنیادی پتھر ہے۔ یہی وہ چیز تھی جس کی بنیاد پر ۹/۱۱ کے واقعہ کے بعد امریکہ نے من مانے اقدامات شروع کر دیے۔ ۹/۱۱ کے بارے میں ڈاکٹر شیر افگن نے بڑا صحیح کہا کہ آج تک وہ ایک پراسرار معاملہ ہے۔ میرے علم میں اس وقت بیس، پچیس تحقیقی کتابیں ہیں اور وہ میری لائبریری میں موجود ہیں جن میں اس واقعہ پر گفتگو ہوئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طریقے سے امریکہ نے اپنی خارجہ پالیسی کے ایک خاص آلے کے طور پر اس واقعہ کو استعمال کیا ہے۔ بعد ازاں ۹/۱۱ کمیشن نے بہت سارے مسائل کو نظر انداز کیا ہے اور پوری بحث کو خاص نقطہ نظر دینے کی کوشش کی ہے۔ یہاں اس بات کو بھی سن لیجیے کہ ہمارے آئی ایس آئی کے چیف بھی ۹/۱۱ کے موقع پر واشنگٹن میں موجود تھے۔ باب وُڈورڈ کہتا ہے کہ پہلے ان کو دھمکایا گیا اور جب انہوں نے کوئی بات چیت کرنے کی کوشش

کی تو انہیں چپ کرا دیا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ یہ تقریر چھوڑ دیجیے، ہاں یا نہیں میں جواب دیجیے۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہو گی۔ انہیں کہا گیا کہ اپنے صدر سے کہو، میں آپ کو جناب والا! پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ:

پاکستان کو ایک کڑا فیصلہ کرنا ہے۔ آیا وہ امریکہ کے ساتھ ہے یا نہیں؟ یہ سیاہ و سفید میں سے ایک کا انتخاب ہے، کوئی درمیانی راستہ نہیں۔

اس کے بعد پھر اس کتاب کے صفحہ ۸۵ کو دیکھیے۔

پاول نے پہلے ہی بش کو بتا دیا تھا کہ اس نے جو قدم اٹھایا ہے وہ پاکستان کی حمایت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا پاکستانیوں کو خبر دار کرنا ہو گا۔

یہ الفاظ سنیے پھر اس کے بعد جناب والا!

مشرف کو بہت زیادہ دبوچنا خطرناک تھا لیکن اسے بالکل نہ دبوچنا اور ہاتھ نہ مروڑنا اس سے بھی زیادہ اور نہ دھمکانا خطرناک تھا۔

ہماری ساری پالیسیاں اس تناظر میں اختیار کی گئیں۔ بعد ازاں جب پاول نے بات کی، یعنی ایک [امریکی] جنرل کی طرف سے دوسرے [پاکستانی] جنرل کے سامنے سات مطالبات کیے گئے۔ بد قسمتی سے ہم نے ایک لمحے میں ان ساتوں مطالبات کو بے چوں و چرا مان لیا۔ پاول اپنی آٹو بائیو گرافی میں لکھتا ہے کہ میرے لیے یہ تعجب کا لمحہ تھا، میرا خیال تھا کہ جنرل مشرف ایک یا دو نکات مان لیں گے اور باقی کے بارے میں معذرت کریں گے لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مشرف نے ساتوں کے ساتوں نکات مان لیے۔ اس کے بعد انہوں نے کیا کہا، صرف دو باتیں انہوں نے کہیں۔ ایک یہ کہ افغانستان کے سلسلے میں ہم حاضر ہیں، ہماری زمین حاضر ہے، ہماری فوجیں حاضر ہیں۔ جس طرف چاہیں کشت و خون کریں لیکن ایک یہ کہ نادرن الائنس کو اقتدار میں نہ لائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے جوہری اثاثوں کو کوئی خطرہ نہ ہو۔

یہ دو باتیں مشرف صاحب نے کہیں، لیکن دونوں کا کیا حشر ہوا۔ جناب والا یہ اسی کتاب کے صفحہ ۲۰۳ پر بیان کیا گیا ہے۔ مشرف صاحب کی ان باتوں کے حوالہ سے امریکی صدر بُش شمالی اتحاد کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں شمالی اتحاد کے بارے میں آپ کی تشویش کو پوری طرح سمجھتا ہوں اور اس کے بعد پھر اعتراف کرتے ہیں، میں ان کے الفاظ آپ کو سناتا ہوں کہ:

> بش نے کہا "ہم اپنے دوستوں کی حوصلہ افزائی کریں گے کہ شمال سے جنوب کے میدانوں کی طرف جائیں لیکن کابل شہر میں نہ جائیں"۔

یہ ان کا وعدہ تھا۔ ہوا کیا؟ افغانستان کو ایک خاص گروہ کے ہاتھوں میں دے دیا گیا اور وہاں انہوں نے پاکستان کے خلاف امریکہ ہی نہیں بھارت کے لیے بھی سارے راستے کھول دیے۔

جناب والا! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت بھارت ان پانچ ممالک میں سے ہے جو معاشی، فوجی اور سفارتی اعتبار سے افغانستان کی مدد کر رہے ہیں اور جناب والا! اس میں بڑی اہم چیز یہ ہے کہ تعمیرات کے نام پر وہاں جو کام ہو رہا ہے، اس میں بھارت کے فوجی شریک ہیں۔ میرے پاس یہ رپورٹ اس بارے میں موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان نے بارڈر روڈ آرگنائزیشن کے ایک فوجی یونٹ کو وہاں پورے ملک میں بنیادی ڈھانچہ تعمیر کرنے کے لیے بھیجا۔ افغانستان میں جو قونصلیٹ قائم کیے گئے یہ تمام قونصلیٹ پاکستان کے خلاف سرگرم ہیں اور آج بلوچستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے ڈانڈے وہیں سے ملتے ہیں۔ ہم نے اپنے پڑوسیوں، ایران، چین اور افغانستان کو محض امریکہ کی خوشنودی کے لیے نظر انداز کیا ہوا ہے۔ جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اُس وقت امریکہ کی سنٹرل کمانڈ کا جو چیف آف اسٹاف تھا جنرل ٹومی فرینکس (Tommy Franks) اس کی آٹو بائیو گرافی ابھی آئی ہے۔ "American Soldier" نامی اس کتاب میں بڑی اہم باتیں بیان کی گئی ہیں۔ درحقیقت انہیں پڑھ کر انسان سر پکڑ لیتا ہے کہ ہمارے پالیسی ساز اور ہمارے حکمران جن پر

قوم کی ذمہ داری ہے وہ کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

میں نے صدر مشرف سے پاکستان میں ملنے کے لیے سفر جاری رکھنے پر غور کیا۔ اگر کبھی بازو مروڑنے کا وقت ملا تو اس کا فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ اسے [صدر مشرف] یہ اعلان کرنا ہو گا کہ وہ کس جانب [امریکہ کے ساتھ یا اس کے خلاف] چل رہا ہے۔ مشرف نے درخواست کی کہ اس مہم کے منصوبے میں بھارتی حکومت یا بھارتی فوج کو شامل نہ کیا جائے۔ خاص طور پر ایسی کوئی صورت نہ ہو جس میں بھارتی افواج پاکستانی بحری و فضائی حدود میں آئیں۔ اس نے مزید درخواست کی کہ بھارت کی اس مہم میں سیاسی شمولیت کی تشہیر نہ کی جائے، اس سے پاکستان میں لوگوں کے جذبات بھڑکیں گے۔

بات چیت ہوئی اور اس میں بازو مروڑنے کی کوئی ضرورت پیش نہ آئی۔ جنرل پرویز مشرف نے فوراً کہا کہ میں آپ کے ساتھ ہوں اور جو کچھ کہو گے ہم کریں گے لیکن خدا کے لیے بھارتی حکومت یا فوج کو شامل نہ کرنا۔ خاص طور پر ایسی کوئی صورت نہ ہو کہ انڈین فوجی پاکستان کی فضائی یا سمندری حدود میں متحرک ہوں۔ ساتھ ہی یہ درخواست کی کہ بھارت کی شرکت کو مشتہر نہ کیا جائے کیونکہ یہ پاکستان کے لیے بہت حساس معاملہ ہو گا۔ آپ کو معلوم ہے جواباً ٹومی فرینکس نے کیا کہا؟ اس کا جواب تھا ہندوستان شامل ہو گا، سیاسی اعتبار سے بھی، فوجی اعتبار سے بھی، البتہ ہاں! آپ کی خاطر ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کا پروپیگنڈا نہ کریں۔

اس کے بعد اس نے پاکستان میں امریکی سفیر وینڈی چیمبرلین (Wendy Chamberlain) سے کہا کہ صدر مشرف کو میرا شکریہ پہنچا دو اور کہو کہ میں افغانستان میں انڈیا کی شمولیت کو کم سے کم دکھانے کی کوشش کروں گا۔

میں اس کے الفاظ دہراتا ہوں جناب والا "میں کوشش کروں گا کہ بھارتی شمولیت کم سے کم نظر آئے"۔ یہ ہے جناب والا! وہ صورت حال۔

پاکستان میں امریکی مداخلت: وزیر صاحب کہہ رہے ہیں کہ امریکہ مداخلت کر رہا ہے۔ لیکن کیا ہم نے اس کی اجازت نہیں دی؟ ۲۷۰۰۰ فوجی مہمات اس وقت تک ہماری سرزمین سے افغانستان میں بھیجی گئیں۔ ہمارے چار اڈے استعمال ہوئے ہیں اور اس کے بعد بھی کیا ہو رہا ہے؟ امریکہ کی افغانستان میں اس وقت صرف ۱۷، یا ۱۸ ہزار فوج ہے، نیٹو کی ۱۸ یا ۲۰ ہزار ہے کل ملا کے چالیس ہزار بنتی ہے۔ دوسری جانب ہم نے وزیرستان کے اندر اسّی ہزار سے ایک لاکھ اپنے فوجی لگائے ہیں جو ہمارے اپنے لوگوں کو مار رہے ہیں۔

میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ دہشت گردی کے حق میں کوئی نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ لوگ تشدد پر کیوں مجبور ہوئے۔ جب تک آپ تشدد کے اسباب دور نہیں کریں گے تو مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ یہ فوجی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم نے دوستوں کو دشمن بنا لیا ہے اور معصوم افراد کو ہم مار رہے ہیں۔ اس کے باوجود بھی امریکہ ہماری خود مختاری کو پامال کر رہا ہے اور امریکہ کے صدارتی امیدوار برملا کہہ رہے ہیں کہ وہ ہم پر براہ راست حملہ کریں گے لیکن یہ نہ سمجھیے کہ یہ محض صدارتی الیکشن کے دوران ایک خاص فضا میں ہو رہا ہے۔ صدر بش نے کم از کم تین بار پریس کانفرنس میں اس بات کا اعتراف کرنے سے انکار کیا ہے کہ اگر ہمارے پاس اطلاع ہو تو پاکستان میں مطلوبہ ٹارگٹ پر حملہ نہیں کریں گے۔ تین بار اس نے اسے ماننے سے انکار کیا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ موجودہ صدر (جارج بش) بھی بعینہ وہی پالیسی اختیار کیے ہوئے ہے، جس کا اعلان بعد میں آنے والے صدارتی امیدوار کر رہے ہیں۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ امریکہ میں بلاشبہ مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں اور ان میں امریکہ کی پالیسی پر کھل کر تنقید کرنے والے بھی ہیں۔ بلکہ درحقیقت آج امریکہ کی یہ پالیسی امریکہ میں بھی اور باقی دنیا میں بھی سب سے زیادہ نامعقول اور ناپسندیدہ سمجھی جانے والی پالیسی ہے۔ لیکن جناب والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ میں وہ طبقہ جو اس وقت اسٹیبلشمنٹ میں اثر رکھتا ہے۔ وہ اسی پالیسی کو جاری رکھنا چاہتا ہے۔ کتنی ہی رپورٹیں اور حتیٰ کہ کتب ہیں جن میں دکھایا گیا ہے کہ کس طریقے سے ایک مخصوص مذہبی قدامت پسند

ذہن(Neocons) ہے، جس نے پالیسی پر غلبہ پالیا ہے اور وہی پالیسی کو چلا رہا ہے۔

جناب والا! ہمیں اچھی طرح سمجھ جانا چاہیے کہ امریکہ کی دوستی اس کی دشمنی سے زیادہ خطرناک ہے۔ ہمارے تعلقات بلاشبہ اچھے ہونے چاہییں لیکن ایجنڈا امریکہ کا نہیں ہونا چاہیے۔ بدقسمتی سے آج ہم امریکہ کے ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں۔ اس کے لیے میں فوری طور پر آپ کو تین مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ پہلی چیز دہشت گردی کے خلاف جنگ ہے۔ یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ نہیں، یہ امریکی دہشت گردی ہے۔ دنیا کی تمام اقوام اور خصوصیت سے مسلمان اس کا ہدف ہیں۔ اس نے پاکستان، ایران، عراق اور افغانستان تباہ کر دیا ہے۔ شام نشانے پر ہے اور ترکی پر بھی نگاہ ہے، انڈونیشیا، ملائشیا بھی آئندہ اہداف ہیں۔ تو یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ نہیں ہے۔ یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے۔

امریکہ کیا چاہتا ہے؟: جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ نے پاکستان کو ٹارگٹ بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری گاجر اور چھڑی (Carrot and stick) والی پالیسی ہے۔ لیکن گاجر ایک دھوکا ہے، اصل چیز چھڑی ہے ابھی چند روز قبل ۲۷ جولائی کو امریکہ میں جو قانون (Protect America Act of 2007) پاس کیا گیا ہے، یہ قانون پاکستان کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ جناب والا! میں نے اس کو لفظ بہ لفظ پڑھا ہے۔ اس میں افغانستان، پاکستان اور سعودی عرب کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ جناب والا! یہی وہ تین ممالک ہیں جنہوں نے امریکہ کی نام نہاد جنگ میں اس کی سب سے زیادہ مدد کی ہے، جنہوں نے اپنے دروازے اس کے لیے کھول دیے ہیں، اس کے باوجود سب سے زیادہ ہدف انہی کو بنایا گیا ہے۔ میں باقی ملکوں کو چھوڑتا ہوں صرف پاکستان کی بات کرتا ہوں۔ خیال کیجئے کہ پاکستان میں کس کس چیز پر امریکہ کی مداخلت ہے۔ وزیر صاحب شکایتاً کہتے ہیں کہ امریکی نائب وزیر آتا ہے اور مشورہ دیتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ یہ تو خود ہماری کمزوری کی بناء پر ہے۔

میری نگاہ میں اپوزیشن اور گورنمنٹ، دونوں کو دوسرے کسی بھی ملک کے کسی

جونیئر عہدیدار سے نہیں ملنا چاہیے؟ صرف اس سے ملنا چاہیے جو ان کا ہم منصب ہو۔ لیکن کیا ستم ظریفی ہے کہ امریکی نائب وزیر آتا ہے اور ہمارے دفتر خارجہ میں جو اس کے متبادل اور مساوی ڈائریکٹر (امریکہ) ہے اس سے وہ بات نہیں کرتا۔ وہ براہ راست آکر صدر مملکت سے بات کرتا ہے اور اخلاقاً وزیر اعظم سے بھی مل لیتا ہے۔ یہ ہے اصل غلطی۔ آپ نے ان کو اپنا وائسرائے حکمران بنالیا ہے۔ اس قدر نیچے آکر جب ہمارا صدر مملکت ان سے ملے گا تو پھر وہ جو بھی توہین آمیز اقدام کریں کم ہوگا۔ آپ یہ دیکھیں کہ انہوں نے اس قانون میں کن کن معاملات کو رکھا ہے۔

- سب سے پہلی چیز وہی ایٹمی ٹیکنالوجی۔ جناب والا! میرے پاس دستاویزات ہیں جن کے مطابق ان پورے پانچ سالوں میں، خاص طور پر پچھلے مہینے امریکی تھنک ٹینکس اور ان کے سرکاری نمائندوں نے یہ بات کی ہے کہ ہم پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کی حفاظت کے بارے میں شبہ رکھتے ہیں اور ہمیں ان کو اپنی گرفت میں لانے کے لیے کوئی نہ کوئی اقدام کرنا ہوگا۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو استعمال کیے گئے ہیں۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر قدیر خان کی بات انہوں نے بھی کی ہے۔ اور یہ اس کے باوجود ہے کہ ڈاکٹر قدیر خان پر کوئی جرم ثابت نہیں ہے اور اگر کسی انسان پر جرم ثابت نہ ہو تو اس پر بات نہیں کی جاسکتی۔ جو کچھ انہوں نے کیا، اس کا انہوں نے اعتراف کیا، وہ کوئی جرم نہیں ہے۔ اب اس سے آگے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ کوئی جرم تھا تو امریکہ نے خود کینیڈا، انگلستان، فرانس، اسرائیل اور بھارت کی ایٹمی ٹیکنالوجی اور ایٹمی صلاحیت بڑھانے میں ایک کردار ادا کر کے یہی جرم کیا ہے۔
- اگلی چیز تعلیم، خاص طور پر سیکولر پبلک اسکولنگ سے متعلق ہے۔ امریکہ کی پالیسی ہے کہ اگر آپ یہاں سیکولر ایجوکیشن کو فروغ دیں گے تو ہم آپ کو مدد دیں گے ورنہ نہیں دیں گے۔ دوسری چیز پورے ملک میں طالبان بمعنی دہشت گرد گروپوں اور ان سے مقابلہ کے لیے دہشت گردی سے نمٹنے والی تجربہ کار فوجوں کی موجودگی

ہے تاکہ معاشرے میں تشدد نہ بڑھے۔ جناب والا! ان مسائل پر الگ سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن انتہاپسندی اور اعتدال جو بھی ہے، ہمارا مسئلہ ہے۔ اس وقت دنیا میں سب سے بڑا انتہاپسند صدر بش ہے اور اصل مسئلہ اس کی انتہاپسندی کی پالیسیاں ہیں۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ:

اسلامی انتہاپسندی سے موثر طور پر نمٹنے اور انتہاپسندوں اور دہشت گردوں کی دیگر ممالک میں نقل و حرکت روکنے کے لیے پاکستان کی سرحدوں کو محفوظ بنانا ہے۔

جناب والا! یہ سارا ہمارا اندرونی ایجنڈا ہے جس پر کہ وہ براہ راست مداخلت کرنے کا اعلان کر رہا ہے۔ اس کی میں صرف دو مثالیں دے کر آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ لال مسجد کی بات بار بار آئی ہے۔ جناب والا! میرے پاس لال مسجد کے سلسلے میں امریکہ سے رپورٹ موجود ہے جس میں ۹ جولائی کو جس وقت لال مسجد میں محصورین سے معاہدہ ہونے والا تھا کہا گیا ہے۔

امریکہ نہیں چاہتا کہ مبینہ طور پر لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں موجود درجنوں خطرناک انتہاپسندوں کو محفوظ راستہ دیا جائے بلکہ ان کے خلاف سخت کارروائی ہو جس کے نتیجہ میں وہ گرفتار ہوں۔

اس کے بعد سمجھنا مشکل نہیں کہ لال مسجد کے حوالہ سے ہمارے یہاں جو کچھ ہوا کس کے کہنے پر ہوا۔

- تیسری چیز جناب والا! سوات اور صوبہ سرحد [موجودہ خیبر پختونخوا] کے علاقوں میں جو فوجیں بھیجی گئی تھیں، یہ ہمارا اپنا علاقہ ہے اور اپنے کسی بھی علاقہ میں فوج بھیجنا یا نہ بھیجنا ہمارا اختیار ہے۔ لیکن امریکہ نے صوبہ سرحد میں فوجوں کی تعیناتی کا مطالبہ کیا۔ یہ ۱۶ جولائی ہے اور اس سے اگلے دن وہاں فوج بھیجی گئی۔ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ جناب والا! میں ساتھ ہی یہ بھی بتادوں، سچی بات یہ ہے کہ دکھ ہوتا ہے ایسی

باتیں پیش کرتے ہوئے لیکن ان حقائق کو سن کر سوچنا چاہئے کہ ہم نے اپنی عزت اور وقعت کو کس قدر گرالیا ہے۔ ابھی آپ پاک افغان امن جرگہ[1] منعقد کر کے آرہے ہیں اور کس طرح آپ انکار کرنے کے بعد ایک ٹیلی فون پر بھاگے بھاگے گئے ہیں۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ کون ڈور کھینچ رہا ہے۔ ذرائع ابلاغ میں جرگے کی جو تفصیلات ہیں انہیں پڑھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ ٹھیک ہے ہمارے اپنے صدر سے اختلافات ہیں۔ ہم جو چاہیں اسے کہہ لیں۔ ہم اس پر تنقید کرتے ہیں اور کریں گے لیکن وہ پاکستان کی عزت ہیں۔ تاہم سنیے کہ اس صدر کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ Even the camp dogs, a white Lab named Musharraf and a mutt called Putin, were getting tired of potatoes.(ٹائم میگزین، ۲۷ اگست ۲۰۰۷ء)۔ یہ عزت ہے آپ کی اور آپ سمجھتے ہیں کہ امریکہ کے ساتھ مل کر آپ نے بڑا کارنامہ انجام دے دیا ہے۔

- اس دوران دوسرا وار جو امریکہ نے کیا ہے وہ انڈیا کے ساتھ ایٹمی تعاون ہے۔ انڈیا این پی ٹی کے خلاف ہے۔ یہ امریکہ کے قوانین کے خلاف ہے۔ یہ بین الاقوامی ایٹمی توانائی اتھارٹی کے خلاف ہے۔ اس کے باوجود امریکہ نے یہ معاہدہ کر لیا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے خلاف امتیازی رویہ اختیار کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاہدہ کے نتیجے کے طور پر بھارت کو ایک ایٹمی طاقت تسلیم کر لیا جائے گا۔ اگر یہ ہو جاتا ہے تو NPT پر دستخط کے بغیر اسے تسلیم شدہ ایٹمی طاقت کا مقام مل جائے گا اور آپ نیٹو سے باہر کے اتحادی کی باتیں کرتے رہیں گے۔ درحقیقت آپ نیٹو سے باہر کے

---

[1] ۹ تا ۱۱ اگست ۲۰۰۷ء: کابل میں افغانستان، پاکستان اور قبائلی رہنماؤں کا بڑا "امن جرگہ" منعقد ہوا تھا جس کا مقصد خطے میں امن کا راستہ تلاش کرنا اور القاعدہ اور طالبان جنگجوؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے حکمت عملی پر بات چیت کرنا تھا۔ جرگہ میں طے ہوا کہ دونوں ممالک اور قبائل اپنے اپنے علاقہ میں اگر کچھ غلط سرگرمیاں ہو رہی ہیں تو انہیں ختم کریں گے۔ اس جرگہ میں دونوں فریقوں نے ایک دوسرے پر الزام لگایا کہ وہ خطہ میں تشدد کی کارروائیوں کو ہوا دے رہے ہیں۔

اتحادی نہیں ہیں، آپ انتہائی قابل نفرت، انتہائی پابندیوں میں جکڑے اتحادی ہیں۔ یہ ساری چیزیں امریکہ کی پالیسی کا رخ صاف ظاہر کرتی ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کریں۔

- جناب والا! اس مرحلے پر میں سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن کی آٹو بائیو گرافی سے ایک اقتباس آپ کے سامنے پیش کروں گا جو فارن پالیسی کے بارے میں ہے۔ یہ اقتباس اس اعتبار سے ایک چشم کشا چیز ہے کہ یہ اس سوچ اور طرز عمل کی نشاندہی کرتا ہے جو امریکہ اپنے دوستوں کے سلسلے میں اختیار کرتا ہے۔ نکسن اپنی کتاب "In the Arena: A Memoir of Victory, Defeat, and Renewal" میں صفحہ ۲۷ پر کہتا ہے:

"میرا سب سے افسوس ناک تجربہ جولائی ۱۹۸۰ء میں قاہرہ میں شاہ ایران کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے سفر کا تھا۔ واشنگٹن سے اس لیڈر کے جنازے میں نمائندگی کرنے کے لیے کسی کو بھی نہیں بھیجا گیا، جو آپ (امریکہ) کے کٹر اور وفادار دوستوں میں سے ایک تھا"۔

جو امریکہ کے وفادار ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیے۔ نکسن آگے چل کر کہتا ہے:

"I was reminded of a haunting remark, President Ayub Khan of Pakistan made to me in 1964".

"۱۹۶۴ء میں پاکستان کے صدر ایوب خان کا اذیت ناک تبصرہ مجھے یاد آیا کہ "جنوبی ویت نام کے صدر ڈائم (Dinh Diem) کے قتل میں امریکی شمولیت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس [ایوب خان] نے کہا کہ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ امریکہ کا دوست ہونا خطرناک ہے، غیر جانبدار رہنا فائدہ مند ہے اور بعض اوقات دشمن ہونا بھی مدد کرتا ہے۔ یہ تبصرہ ایک بار پھر اس وقت میرے ذہن میں آیا جب مجھے بتایا گیا کہ امریکہ کے ایک اور قریبی دوست صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق بظاہر تخریب

کاری کے نتیجہ میں ہوائی جہاز تباہ ہونے کے سبب پراسرار موت کا شکار ہو گئے"۔

"وہ بھی امریکہ کا دوست تھا اور امریکہ نے اس کو ختم کروایا"۔

کیا کرنا چاہیے؟

جناب والا! میری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ دوستی ہم دنیا کے تمام ممالک کے ساتھ رکھتے ہیں اور رکھنا چاہتے ہیں۔ امریکہ سپر پاور ہے، کوئی اس سے انکار نہیں کر رہا ہے۔ اس سے تعلقات بھی ضرور ہونے چاہییں، تجارت بھی ضرور ہونی چاہیے لیکن جناب والا! جس طرح اس کے احکامات کی پیروی ہم کر رہے ہیں، جس طرح ہم نے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو دہشت گردی کے خلاف اس کی نام نہاد جنگ میں شریک کر لیا ہے یہ کسی طرح بھی جاری نہیں رہنا چاہیے۔ اور جناب والا! آپ کی اطلاع کے لیے عرض کروں کہ دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں برطانیہ امریکہ کا سب سے زیادہ اہم حلیف تھا۔ Gordon Brown نے ۲۰۰۷ء میں وزیر اعظم بننے کے بعد پہلا کام یہ کیا ہے کہ 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کے الفاظ استعمال کرنا ترک کر دیے ہیں۔ اور اپنے تمام وزراء کو باقاعدہ ہدایت کی ہے جو برطانیہ کے اخبارات کے اندر جلی حروف میں شائع ہوئی ہے کہ اس مہم کو دہشت گردی کے خلاف جنگ نہ کہا جائے۔ اس سے پہلے ۲۰۰۴ء میں اسپین کا وزیر اعظم شکست کھا چکا ہے اور اسپین کی نئی حکومت نے اپنی فوجیں عراق سے واپس بلالیں۔ اٹلی کا وزیر اعظم برلس کونی (Berlusconi) جو جارج بش کا بہت بڑا حمایتی اور امریکہ کا حلیف تھا وہ ۲۰۰۶ء کا انتخاب ہار گیا۔

جناب والا! ہمیں جان لینا چاہیے کہ دنیا کی فضا بالکل بدل رہی ہے۔

Current History امریکہ کا نمایاں میگزین ہے۔ دسمبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں Global Trends 2007 پورا اسی عنوان پر ہے۔ میں صرف چند جملے آپ کو پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔ وہ لکھتا ہے:

چار سال قبل جارج ڈبلیو بش نے عراق، شمالی کوریا اور ایران کو 'امن عالم کو نقصان پہنچانے کے لیے اسلحہ جمع کرنے والے برائی کا محور' قرار دیا تھا۔ آج وہ لوگ جنہوں نے عراق میں استحکام لانے کے لیے کسی منصوبہ بندی کے بغیر مداخلت کی، قبضہ کیا، انہیں آج وہاں کی خانہ جنگی اور افراتفری کے خاتمہ کی کھلے دل کے ساتھ ذمہ داری تسلیم کرنا ہوگی۔

واشنگٹن پر یہ الزام آتا ہے کہ اس نے ان کے ساتھ سنجیدگی سے تعلق قائم کرنے کی بجائے اکڑفوں دکھانے اور انہیں دھمکیاں دینے کو ترجیح دی۔

امریکی کانگریس کے نومبر میں ہونے والے انتخابات میں ووٹروں نے امریکی صدر کی پالیسیوں کو زور وشور سے مسترد کر دیا جو کہ پہلے ہی امریکہ کی آئینی قوت اور اخلاقی اختیار حیثیت کو متاثر کر چکی تھیں۔ وائٹ ہاؤس نے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حملوں کے بعد، پیدا ہونے والے فوجی اتحاد کے جذبوں کی تعمیر کے بجائے، دہشت گردی کے خلاف جنگ کو خوف پھیلانے، مخالفین کی توہین کرنے، جانچ پڑتال میں سختی کے ذریعہ گھٹن پیدا کرنے اور حکومتی انتظامیہ کے لیے مزید اختیارات کے حصول کے ہتھیار میں تبدیل کر کے ملک کو کمزور اور تقسیم کر دیا۔

وہ مزید کہتا ہے کہ:

امریکہ نے اپنی روایات اور اقدار کی بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ ہماری آزادیوں سے نفرت کرنے والوں سے جنگ و تصادم کے نام پر امریکہ اب ایک ایسا ملک بن گیا ہے جس نے ملک کے باہر خفیہ جیلیں بنائیں اور جو مشتبہ افراد کو عدالتی کارروائی کے بغیر غیر معینہ مدت تک قید کرتا ہے، صحافیوں کو عدالتوں میں گھسیٹنے کی دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔

آخر میں وہ کہتا ہے کہ:

امریکہ نے ایک ایسے وقت میں وقار اور اقتدار کھو دیا ہے جب دنیا کو پیچیدہ اور خطرناک مسائل وغیرہ کو حل کرنے کے لیے بین الاقوامی اداروں کی صلاحیت کو مستحکم کرنے کے لیے امریکی مدد کی ضرورت ہے۔ کم ہوتا ہوا امریکی اعتبار اور امریکی سوچ و عمل کی بڑھتی ہوئی مخالفت نے مشکلات کو پیچیدہ تر کر دیا ہے۔

جناب والا! جس وقت ساری دنیا اس دہشت گردی کے خلاف جنگ کے کھیل کو سمجھ رہی ہے آخر ہم ہی آخری دن تک کیوں شریک ہیں اور اس کی خاطر اپنوں کو مار رہے ہیں۔ درحقیقت اس کی بناء پر ہم اپنے ملک میں دہشت گردی کو فروغ دے رہے ہیں۔ یادرکھیئے؟ دہشت گردی جنم دیتی ہے دہشت گردی اور تشدد کو۔ سیاسی مسائل کا حل سیاسی ہے، اخلاقی ہے، بات چیت ہے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ جناب والا! آج کی بحث کا پیغام یہ ہے کہ:

۱۔ جنرل پرویز مشرف نے خاص طور پر ۹/۱۱ کے بعد جو خارجہ پالیسی اختیار کی وہ ناکام رہی ہے۔ اس نے ہمارے دوستوں کو ہم سے دور کیا ہے اور جو دوست نہ تھے اور نہ ہو سکتے ہیں اور جن کی دوستی پر اعتبار کرنا بڑی حماقت ہے اور ہماری پوری تاریخ کا تجربہ اس کی گواہی دیتا ہے، ہم نے ان پر اعتماد کر کے اپنے آپ کو کمزور کیا ہے۔ دنیا محض امریکہ اور اس کے چند حواری نہیں ہیں۔ اصل دنیا وہ ساڑھے چھ بلین انسان ہیں جو امریکی استعمار کے خلاف بغاوت کیے ہوئے ہیں۔ جس کا ذکر شیر افگن صاحب نے بھی کیا اور میں نے تو اپنی آنکھوں سے وہ مظاہرہ لندن میں دیکھا تھا جو عراق جنگ کے خلاف ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پورا انگلستان امڈ آیا ہے۔ یہ مسئلہ انگلستان کا نہیں بلکہ پوری دنیا کا ہے۔ رائے عامہ کے جتنے بھی سروے ہوئے ہیں ان میں اس وقت مسلم دنیا میں ۹۲ سے ۹۸ فیصد، یورپ میں ۷۰ سے ۸۰ فیصد اور خود امریکہ میں ۶۰ فیصد سے زیادہ لوگ بش کی دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر بنائی گئی پالیسیوں کے خلاف ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہم اسی (بش) کی دم کے ساتھ بندھے

ہوئے ہیں۔ جناب والا! میرا پیغام یہ ہے کہ اس پر نظر ثانی کیجیے، میں کوئی محاذ آرائی کی بات نہیں کر رہا لیکن خدا کے لیے جذبہ پیدا کیجیے، دوبارہ بات کیجیے، اس چنگل سے نکلیے اور اپنی قوم پر اعتماد کیجیے۔

۲۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھنا ضروری ہے جناب والا! کہ پالیسی بنانا ایک فرد واحد کے ہاتھ میں نہیں ہونا چاہیے۔ فیصلہ سازی میں شوریٰ، مشاورتی ادارے، پارلیمنٹ اور حتّٰی کہ دفتر خارجہ کی شمولیت ضروری ہے۔

مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے اور میں پوری ذمہ داری سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ کئی مواقع ایسے آئے، جن میں کشمیر کی پالیسی بھی ہے، کہ جو اعلان یا جو یوٹرن ان پالیسیوں کے بارے میں لیا گیا دفتر خارجہ کو اس کی اطلاع اخبارات سے ملی ہے۔ جہاں پالیسی پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے وہیں فیصلہ سازی کا عمل درست کرنے کی ضرورت ہے۔ جس ادارتی فیصلہ سازی کی ضرورت ہے اس کے بغیر ملک اس بحران سے نہیں نکل سکتا۔ آج کی گفتگو کا پیغام یہی ہے کہ آیئے یہ ایوان متفقہ طور پر یہ طے کرے کہ امریکہ سے دوستی کے نام پر غلامی کا جو رشتہ ہم نے استوار کیا ہے یہ ہماری آزادی اور خود مختاری، ہماری سلامتی اور ہمارے مفادات، ہماری جغرافیائی حیثیت اور ہماری تاریخ کے خلاف ہے۔ ہمیں اس پر نظر ثانی کرنا ہے۔ ہم کسی محاذ آرائی کی بات نہیں کر رہے لیکن موجودہ پالیسی کو بدل کر عزت واحترام کا رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں۔ پالیسی اپنے مفادات کے مطابق ہونی چاہیے نہ کہ یہ ہو کہ ہم امریکہ کے مفادات کے لیے چاکری کریں۔

۳۔ اختتام کرتے ہوئے میرا اگلا پیغام یہ ہے کہ ملک میں خارجہ پالیسی کے بنانے کا جو طریقہ ہے اس کو بدلنا ہے۔ اس میں تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس میں دفتر خارجہ کی شرکت کی ضرورت ہے اور سب سے بڑھ کر پارلیمنٹ کی شمولیت ضروری ہے، پارلیمنٹ کو حتمی طور پر طے کرنے کا موقع ہونا چاہیے۔ آپ بھارت کو دیکھیے کہ

بھارت کے لیے بھارت امریکہ ایٹمی معاہدہ کتنا اہم ہے لیکن اس پر بھی آج وہاں پارلیمنٹ میں بحث ہو رہی ہے۔ ہمارے یہاں ہر چیز پارلیمنٹ سے بالا بالا ہو جاتی ہے۔ سارا مشاورتی عمل اور ساری ریسرچ پارلیمنٹ سے باہر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دھوکے کھا رہے ہیں۔ جناب والا! کسی نے کہا ہے کہ 'ٹھوکریں کھا کر تو سنبھل جاتے ہیں لوگ' لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم جوتیاں کھا کر بھی سنبھلنے کے لیے تیار نہیں۔

۴۔ خدا کے لیے یہ راستہ بدلیے، فارن پالیسی کی تبدیلی کرتے ہوئے امریکہ سے تعلقات کو نئی بنیادوں پر استوار کیجیے اور اپنی آزادی کا تحفظ، اپنی سلامتی، اقدار اور مفادات کی حفاظت کیجیے۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے ہم موجودہ بدترین صورت حال سے نکل سکتے ہیں۔

(۲۱ اگست ۲۰۰۷ء)

امریکی صدر بش کا دورہ پاکستان اور دوطرفہ تعلقات

امریکی صدر جارج ڈبلیو بش یکم تا ۵ مارچ ۲۰۰۶ء بھارت اور پاکستان کے دورے پر آئے۔ اس پانچ روزہ دورے میں پاکستان کے لیے ایک دن اور بھارت کے لیے چار دن رکھے گئے۔ دورہ میں امریکہ اور بھارت کے درمیان نو معاہدوں پر دستخط ہوئے جس میں سب سے زیادہ اہم بھارت کو سول نیوکلیئر ٹیکنالوجی کی منتقلی کا معاہدہ تھا۔ دوسری جانب دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ میں بطور اتحادی ملک صدر بش نے پاکستان سے طالبان اور ''انتہاپسند اسلامی جنگجوؤں'' کے خلاف کارروائی بڑھانے کا مطالبہ کیا۔ لیکن معاشی، تعلیمی، سائنسی اور ٹیکنالوجی کے میدان میں تعاون کا کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔ گویا واضح کر دیا گیا کہ اب امریکہ بھارت اور پاکستان کے ساتھ برابری کا معاملہ نہیں کرے گا۔ اس پس منظر میں پاکستانی پارلیمنٹ کے کئی اراکین کی جانب سے خارجہ پالیسی اور پاک امریکہ تعلقات پر بحث کے مطالبہ پر سینیٹ آف پاکستان نے ایک مکمل اجلاس میں خارجہ پالیسی کا جائزہ لیا۔ اس موقع پر پروفیسر خورشید احمد نے خارجہ پالیسی کی تشکیل کے بین الاقوامی معیارات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کیا اقدامات ہیں جنہیں اپنا کر پاکستان اپنی خارجہ پالیسی کو نیا رخ دے سکتا ہے۔

جناب والا! آپ کی اجازت سے میں حتی الوسع کوشش کروں گا کہ محض ضروری نکات آپ کے سامنے رکھوں۔ مواد میرے پاس بہت ہے لیکن اپنی صحت کی خرابی کی بناء پر شاید میں تفصیل میں جانے کا حق ادا نہ کر سکوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہماری اصل خواہش یہ تھی کہ عمومی بحث کے بجائے صدر بش کے جنوبی ایشیاء کے دورے کے حوالے سے خارجہ پالیسی پر بحث کریں بالخصوص جبکہ خارجہ پالیسی کے بارے میں پہلے ہی قرارداد موجود ہے۔

تاہم چونکہ سینیٹ نے گفتگو کا دائرہ وسیع کر دیا ہے اس لیے میں خارجہ پالیسی کے وسیع تر تناظر میں صدر بش کے دورے کے بارے میں بات کروں گا۔

جناب والا! جہاں تک عالمی میڈیا اور پاکستانی میڈیا کا تعلق ہے، ان میں ایک بات پر اتفاق ہے کہ صدر بش کا پاکستان کا دورہ بہت ناکام تھا۔ نیویارک ٹائمز (New York Times) نے یہاں تک لکھا کہ وہ اگر تشریف نہ لاتے تو بہتر تھا۔ میں اس سے ہٹ کر ایک اور بات کہنا چاہ رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ صدر امریکہ کا دورہ خواہ کتنا بھی ناکام رہا ہو لیکن ایک پہلو سے یہ دورہ بڑا کامیاب ہے۔ میری نگاہ میں وہ پہلو یہ ہے کہ اس دورے کی شکل میں پاکستان کی قیادت کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا گیا ہے۔ آئینہ دکھا کر اسے بتایا گیا ہے کہ امریکہ کی نگاہ میں پاکستان اور اس کی حکومت کی کیا وقعت ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کی ناکامی امریکی صدر بش کے اس دورے سے اس طرح عیاں ہو کر سامنے آگئی ہے کہ اس پر کوئی پردہ ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ میری نگاہ میں بنیادی طور پر پالیسی پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور میں اسی کی طرف اپنی توجہ مرتکز کرنا چاہوں گا۔

خارجہ پالیسی کے جائزہ کی بنیادیں

جناب والا! آپ جانتے ہیں کہ خارجہ پالیسی میں پڑوسی ممالک سے تعلق سب سے اہم چیز ہے اور دوسری جانب اس میں کامیابی کا معیار یہ ہے کہ آپ دنیا میں کتنے دوست بناتے ہیں، کتنا تعاون حاصل کر لیتے ہیں اور آپ کے جو قومی مفاد، عزائم اور عالمی سطح پر اہداف ہیں، ان کے لیے عالمی فضا کو کتنا ساز گار بنا سکتے ہیں۔

اس پالیسی کا دوسرا پہلو معیشت ہوتی ہے کہ ہم کہاں تک اپنی معیشت، ترقی، تجارت اور سرمایہ کاری کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ تیسرا ہدف ثقافتی ہے اور چوتھا اور آخری دفاعی ہے جس کی اپنی ایک بیرونی جہت ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ خارجہ پالیسی کا جائزہ ان چاروں بنیادوں پر لیا جانا چاہیے اور میری نگاہ میں اس میں تین پہلو ایسے ہیں جن پر غور کرنا ضروری

ہے۔ پہلا یہ ہے کہ خارجہ پالیسی تشکیل دینے کا عمل کیا ہے؟ دوسرا پالیسی کا بیانیہ اور تیسرا اس پر عملدرآمد کا طریقہ اور مشینری۔ کسی کامیاب یا ناکام خارجہ پالیسی کا جائزہ ان ہی بنیادوں پر لیا جاتا ہے۔

خارجہ پالیسی کی تشکیل: جناب والا! پہلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک جمہوری ملک میں خارجہ پالیسی اس ملک کی پارلیمنٹ، پارلیمنٹ کی کمیٹیاں، کیبنٹ اور سوسائٹی میں جتنے بھی متعلقہ گروہ ہیں ان کے تعاون اور شمولیت سے بنا کرتی ہے۔ لیکن میں بڑے دکھ سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں خارجہ پالیسی پارلیمنٹ میں نہیں بن رہی۔ بلکہ درحقیقت یہ دفتر خارجہ سے بھی تشکیل نہیں ہو رہی اور اس میں کیبنٹ کا بھی کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے جی ایچ کیو اور امریکی دارالحکومت واشنگٹن میں ایک رابطہ موجود ہے اور ہر چیز اس رابطہ کے نتیجے میں سامنے آرہی ہے۔ آپ ذرا غور کیجیے کہ امریکی صدر بش صاحب تشریف لاتے ہیں اور ہمارے صدر سے ان کی بات چیت ہوتی ہے، حالانکہ ہمارا نظام پارلیمانی ہے اور اصولاً یہاں وزیراعظم سے ہی بات چیت ہونی چاہیے۔ آپ دیکھیں کہ ہندوستان میں ساری بات چیت وہاں کے وزیراعظم سے ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں آنے سے پہلے ایشیائی سوسائٹی میں صدر بش نے بھارت اور پاکستان کے حوالہ سے جو تقریر کی ہے وہ پڑھنا ضروری ہے۔ اس تقریر میں اس نے پاکستان کا لفظ ایک بار استعمال نہیں کیا جبکہ صرف جنرل مشرف کا نام ۱۶ بار لیا ہے۔ یہاں آنے کے بعد بھی وزیراعظم اور کابینہ غیر متعلق تھی، ساری بات چیت ایک شخص سے ہی ہو رہی تھی۔ ہمارا دستور، جس پر میں نے اور آپ نے حلف لیا ہے، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس میں شامل آرٹیکل ۹۱ اور آرٹیکل ۹۸ دستور کو پارلیمانی قرار دیتے ہیں اور پارلیمانی دستور میں صدر کے نام پر وزیراعظم اور کابینہ، پارلیمنٹ کی طرف سے معاملات کو طے کرتے ہیں۔ اس کو نظرانداز کر دینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں پالیسی بنانے کا عمل بگڑ چکا ہے، صرف جی ایچ کیو اور صدر جنرل مشرف ہی سارا کھیل کھیل رہے ہیں۔

جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت پالیسی میں بڑے تضادات ہیں۔ آپ اخبار اٹھا کر دیکھ لیجیے، دفتر خارجہ ایک بات کہنے کی کوشش کرتا ہے، مثال کے طور پر کشمیر کے مسئلے پر کہا گیا کہ اقوام متحدہ کی قراردادیں غیر متعلق ہیں۔ دوسری جانب اسی دن جو بیان وزیر خارجہ کا تھا وہ اس سے بہت مختلف تھا۔ اسی طریقے سے کشمیر کو سات خطوں میں تقسیم کرنے کی بات کی گئی اور استصواب رائے کا حق جو ہماری پالیسی کی بنیاد ہے، ہم اس سے ہٹ کر خود حکمرانی (Self-Governance) پر آگئے اور دفتر خارجہ کا اس میں کوئی عمل دخل نظر نہیں آتا۔

آپ صدر بش کے دورے کو بھی دیکھ لیجیے، اس کے آنے سے پہلے یہ خطرہ صاف نظر آرہا تھا کہ بھارت اور امریکہ کے درمیان ایٹمی معاہدہ ہو رہا ہے۔ اسی ہفتے ۲۰ مارچ کا امریکہ کا جو ٹائمز میگزین کا شمارہ آیا ہے، اس میں آپ پڑھ لیجیے کہ بھارتی لابی کس طرح اس کے لیے کام کر رہی تھی۔ انہوں نے واضح اطلاع دے کر بتایا کہ آٹھ لاکھ ڈالر لابنگ کی ایک کمپنی کو دیے گئے ہیں جو انڈیا میں سابق امریکی سفیر کی سرپرستی میں کام کر رہی ہے۔ ایک اور کمپنی کو چھ لاکھ ڈالر صرف اس مقصد کی لابنگ کے لیے دیے گئے کہ وہ اس ایٹمی معاہدے کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کام کرے۔ یہ ساری چیزیں نظر آرہی تھیں، لیکن ہم خوش فہمیوں میں مبتلا تھے اور دعویٰ کر رہے تھے کہ امریکہ کی جانب سے بھارت اور پاکستان کے درمیان برابری کا معاملہ ہو گا۔ مگر ہوا کیا؟ اس کے بعد اب 'انگور کھٹے ہیں' کا منظر ہمیں نظر آتا ہے۔

اب مشرف صاحب خود کہہ رہے ہیں کہ گویا ہمیں اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کونڈولیزا رائس اور بش دونوں یہ کہہ کر ہمارے منہ پر طمانچہ مارتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کے معاملات الگ الگ ہیں، ان دونوں کی تاریخ اور ضروریات مختلف ہیں، اس لیے اس معاملے میں ہم آپ سے برابر کا معاملہ نہیں کر سکتے۔ اس کے مقابلے میں آپ کے جو امریکہ میں سفیر ہیں، ان کا بیان پڑھیے تو وہ کہہ رہے ہیں کہ وہ لابنگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وزیر خارجہ کا بیان اس مسئلہ پر آیا کہ یہ معاہدہ اس علاقے میں توازن کو بگاڑ دے گا، پاکستان

کے لیے زیر دستی کی پوزیشن ہوگی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کچھ اور دوسرا کچھ اور بات کہہ رہا ہے یعنی وہ جو پرانا مقولہ ہے کہ 'من چہ می گویم، جمورا من چہ گوید' [میں کیا کہہ رہا ہوں، میرا جمورا کیا کہہ رہا ہے]، یہ مقولہ ہمیں صدر اور دفتر خارجہ کے بیانات میں عملاً نظر آتا ہے۔

جناب والا! میں یہ بھی کہوں گا کہ اگر آپ اس کے ساتھ ساتھ تاریخی اعتبار سے بھی چیزوں کو پڑھیں تو بڑی پریشان کن صورت حال سامنے آتی ہے۔ باب وڈورڈ کی کتاب Bush At War آپ نے دیکھی ہوگی۔ اسی طرح امریکہ کے سابق سنٹرل کمانڈر جنرل زینی کی آٹوبائیو گرافی آئی ہے اور اگرچہ یہ چند برس پہلے کی کتاب ہے لیکن اس کتاب میں اس نے صاف لکھا ہے کہ ہمیں جب ایمل کانسی کو پاکستان سے پکڑنا تھا تو ہم نے سوچا کہ کیا کریں۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ صحیح راستہ یہ ہے کہ براہ راست ہم چیف آف آرمی اسٹاف سے رابطہ کریں اور اس رابطہ نے بہترین کام کیا، یہ کتاب میں موجود ہے۔ جنرل فرینک کی کتاب جو ۹/۱۱ کے وقت کمانڈر ان چیف تھا اس میں اس نے پوری تفصیلات بیان کی ہیں۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایوب خان کے دور سے جو معاملہ شروع ہوا ہے کہ پنٹاگان، وائٹ ہاؤس اور جی ایچ کیو ہماری خارجہ پالیسی کا رابطہ بن گئے ہیں یہی سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ دفتر خارجہ اور پارلیمنٹ کا رول نہ ہونے کے برابر ہے اور یہ بڑی خطرناک صورت حال ہے۔ دفتر خارجہ کے بارے میں مجھے یہ کہنے کی بھی اجازت دیجیے کہ تحقیقی کردار جو کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی کے بنانے میں بڑا اہم ہے، ہمارے ہاں مفقود ہے۔ میں تیس سال سے یہ رونا رو رہا ہوں لیکن بدقسمتی ہے کہ صورت حال بہتر نہیں ہو رہی۔ Institute of Strategic Studies جو دفتر خارجہ کے لیے اور اس سے وابستہ تحقیق کا ادارہ ہے اس کی تحقیقات براہ راست منگوا کر آپ دیکھیے اور خارجہ پالیسی کو دیکھیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پالیسی کی تشکیل میں تحقیق کا کردار ہمارے ہاں ہے ہی نہیں اور نہ ہی پارلیمنٹ اور دیگر متعلقہ اداروں کا کوئی کردار ہے۔ جناب والا! ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس طرح فارن پالیسی کو کبھی بھی مؤثر نہیں بنایا جا سکتا۔

عالمی تعلقات میں توازن: جناب والا! میں دوسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ سے ہمارے تعلقات جس طریقے سے تشکیل پائے ہیں اگر اس وقت میں اس تفصیل میں نہ بھی جاؤں تو ایک چیز بڑی واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ امریکہ کے مقاصد اور پاکستان کے مقاصد ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اس لیے امریکہ کے ساتھ تعلقات میں پاکستان کے مفادات کبھی بھی حاصل نہیں ہوئے۔ اگر کبھی کوئی فائدہ جزوی طور پر حاصل بھی ہوا ہے تو اسے محبت اور نفرت کی یکجائی کے عالم میں دونوں ملکوں نے اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ظاہر ہے یہ فائدہ انہوں نے زیادہ اور ہم نے کم حاصل کیا ہے۔ اسی طرز عمل کا تسلسل ہے کہ آج بھی ہم نے اپنے سارے انڈے ایک جھولی میں ڈال دیے اور امریکہ نے بھی صاف کہہ دیا ہے کہ پاکستان سے ہمارے تعلق کی ایک اور صرف ایک بنیاد ہے اور وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ ہے باقی سارے معاملات میں گویا کہ پاکستان غیر متعلق ہے۔

ایک بڑی اہم کتاب جو رینڈ کارپوریشن نے شائع کی ہے میرے پاس موجود ہے اور اس حوالہ سے پڑھنے کے لائق ہے۔ کتاب اس مسئلے پر ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جو تعاون ہو رہا ہے اس میں انڈیا اور پاکستان کا کیا کردار ہے؟ اس کتاب میں انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ ہمارا نہ صرف پاکستان میں کوئی مفاد ہے بلکہ پاکستان کی شرکت پر بھی ہم اعتماد نہیں کرتے۔ پاکستان ایک ناقابل اعتماد شراکت دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طرف سے ہمیشہ Do more, Do more کے مطالبات ہوتے ہیں، ہمارا ہاتھ مروڑا جاتا ہے، ناک رگڑوائی جاتی ہے اور مجبور ہی نہیں کیا جاتا بلکہ تذلیل کی جاتی ہے۔

رینڈ کارپوریشن کی اس رپورٹ کے اندر پوری تفصیل انہوں نے دی ہے کہ ہم نے پاکستان سے ۹/۱۱ کے بعد کیا حاصل کیا اور پاکستان نے ہمیں کیا سہولتیں دی ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے پاکستان کا دو تہائی فضائی علاقہ ہماری دسترس میں ہے۔ ساری چیزیں وہاں موجود ہیں، میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں، یہ مستند ذرائع کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ یہ رپورٹ امریکی

فضائیہ کی درخواست پر تیار کی گئی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ چیزیں محض اطلاع عامہ کے لیے آتی ہیں ان کے محرکات کو بھی ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس میں ایک دفعہ نہیں بلکہ متعدد بار انہوں نے یہ بات کہی کہ ہم پاکستان پر بھروسہ نہیں کرسکتے۔

اور جناب والا! محض یہی ایک رپورٹ نہیں ہے۔ آپ امریکہ کا پریس اٹھا کر دیکھ لیجیے، اس وقت پورا زور یہ ہے کہ گویا پاکستان دھوکہ دے رہا ہے، چنانچہ پاکستان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ حتّٰی کہ ۲۵ جنوری ۲۰۰۶ء کو واشنگٹن پوسٹ کے اداریے میں جو وزیراعظم کی امریکی صدر سے ملاقات کے ایک دن کے بعد لکھا گیا ہے پاکستان کے صدر کا تذکرہ بھی بہت توہین آمیز انداز میں کیا گیا ہے۔ انہیں شوخ، بھڑکیلا اور سجیلا، عسکری حکمراں اور Meretricious کے لفظ سے متعارف کرایا گیا ہے۔ اور یہ بڑا ہی شرمناک لفظ ہے یونانی زبان میں ناقابل اعتماد عورت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ ہمارے لیے انہوں نے استعمال کیا ہے۔ ایک طرف آپ ان کے آگے بچھے جارہے ہیں اور دوسری طرف جس چیز سے آپ کو شناخت ملی اسی سے انہوں نے آپ کو ناقابل اعتماد قرار دیا۔ یہ بڑا سنجیدہ مسئلہ ہے۔

پاکستان، بھارت، امریکہ تکون: جناب والا! اگلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بش کے اس دورے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ اس سے پہلے، چاہے مصنوعی ہی سہی، امریکہ نے جنوبی ایشیا میں نام نہاد برابری کی پالیسی اختیار کی ہوئی تھی۔ یعنی پاکستان اور انڈیا دونوں کے جو مطالبات ہیں مجموعی حالات کی روشنی میں ان میں کسی نہ کسی درجے میں بھی کوئی توازن قائم رہے۔ اب جو واضح پالیسی طے ہوئی ہے، اس میں نئی اصطلاح De-hyphenation استعمال کی گئی ہے۔ De-hyphenation کے معنی یہ ہیں کہ اب امریکہ پاکستان سے الگ اور بھارت سے الگ بات کرے گا اور بھارت اور پاکستان کا جو تعلق ہے، ان سے متعلق معاملات اور دوسری سرگرمیاں علیحدہ علیحدہ قرار دے دی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے معاملے کو اب ایک رکاوٹ سمجھا جارہا ہے اور کشمیر کے مسئلے کو کسی بھی طرح، اونے پونے جس طریقے سے بھی ہو جائے تحلیل کرنا پیش نظر ہے، تاکہ امریکہ

بھارت سے جو معاملات کرنا چاہتا ہے ان کو آگے بڑھا سکے۔ جناب والا! ہمارے لیے یہ بڑی اہم، خطرناک اور قابل غور پیش رفت ہے۔ یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اب امریکہ نے بھارت کو اپنا تزویراتی شراکت دار (Strategic partner) بنا لیا ہے اور اس کی عالمگیر حکمت عملی میں بھارت ایک اہم کردار کرے گا۔ میں یہ بھی کہہ دوں کہ یہ بات آج نہیں ہوئی ہے، اس کے لیے Chester Bowles کے زمانے سے جب (۵۳۔۱۹۵۱ء) وہ بھارت میں امریکہ کا سفیر تھا، کوشش ہو رہی تھی۔ جو دستاویزات شائع ہوئی ہیں ان میں Chester Bowles نے صاف طور پر بار بار لکھا ہے کہ ہم یہ غلطی کر رہے ہیں کہ سارا انحصار پاکستان پر کر رہے ہیں، ہمیں بھارت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

اس کے بعد ۱۹۹۲ء میں امریکہ کی جغرافیائی حکمت عملی کی جو دستاویزات آئی ہیں، ان میں یہ کہا گیا ہے کہ اب ہمیں بھارت کے بارے میں دوبارہ غور کرنا چاہیے۔ کلنٹن نے کل ہی لکھا ہے کہ جس وقت بھارت نے ایٹمی تجربہ کیا، میں نے کہا تھا کہ بھارت کے خلاف پابندیاں نہ لگاؤ اس لیے کہ بھارت ایک مختلف کیس ہے۔ اسی طریقے سے جب ۱۹۹۵ء میں راجیو گاندھی امریکہ گیا تو ٹیکنالوجی کی منتقلی کا معاہدہ ہوا، اس کا یہ سارا پس منظر ہے۔ اس کے بعد اب جو نقطہ انتہا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ بات طے کر لی ہے کہ بھارت کو عالمی طاقت تسلیم کرتے ہوئے عالمی شراکت دار کی حیثیت سے بڑھایا جائے گا۔ اسی بنیاد پر بھارت کے ساتھ ایٹمی معاہدہ ہوا ہے۔ میرے پاس ساری تفصیلات موجود ہیں کہ نو معاہدے صرف بش کے اس دورے کے دوران ہوئے ہیں جبکہ ہمارے ہاں ایک بھی معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ بھارت میں ہونے والے ان معاہدات کا تعلق ایٹمی اور فوجی تعاون، اقتصادی تعاون اور سرکاری اور تعلیم کے معاملات سے ہے۔ یہ منظر نامہ سامنے رکھ کر ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ہوا کا رخ کیا ہے۔

ساتھ ہی جناب والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ دراصل چین کو گھیرنے کے لیے ایک نئی حکمت عملی کا حصہ بھی ہے جس پر امریکہ کام کر رہا ہے اور اس میں بھارت ایک

خاص کردار ادا کر رہا ہے یہ بڑی خطرناک صورت حال ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی پالیسی پر نظر ثانی کریں۔ پالیسی پر نظر ثانی کرنے میں پہلی چیز پالیسی بنانے کا عمل ہے۔ جی ایچ کیو کا ایک کردار ہے اور ہونا چاہیے۔ اسی طرح انٹیلی جنس اداروں کا ایک کردار ہے اور ہونا چاہیے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرتا لیکن سول نظام، پارلیمنٹ، کابینہ اور پوری سول سوسائٹی اور اس کی امنگوں کا بالاتر کردار ہے۔ دوسری جانب خارجہ پالیسی کو ایک رخی نہیں دوطرفہ ہونا چاہیے، قومی یعنی ایک جماعتی نہیں مشترکہ ہونا چاہیے۔ امریکہ میں ایک دفعہ نہیں دہائیوں تک دوطرفہ پالیسی رہی ہے۔ ہمارے لیے بھی یہ وقت آگیا ہے کہ پالیسی کو فٹ بال نہ بنائیں بلکہ اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے لائحہ عمل اختیار کریں۔ اس میں تحقیق کی بھی ضرورت ہے اور سول شراکت کی بھی ضرورت ہے اور حتمی فیصلے کا اختیار سول مقتدرہ کو ہونا چاہیے فوج کو یا انٹیلی جنس کو نہیں۔

عالمی حالات میں تبدیلی: جناب والا! امریکہ بلاشبہ اس وقت اکیلا سپر پاور ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ یورپ، لاطینی امریکہ اور باقی ساری دنیا میں، حتّٰی کہ خود امریکہ میں امریکی پالیسیاں نامقبول ہو رہی ہیں۔ رائے عامہ کے جائزہ میں امریکہ کا اتحادیوں کے بغیر خارجہ پالیسی اپنانے کا عمل (Unilateralism) اور پیش بندی کے طور پر دشمن پر حملے (Pre-emptive strikes) کے نظریات اور اقتدار کی تبدیلی (Regime change) کی پالیسی اور جو نئی فارن پالیسی اس زمانے میں بنائی گئی ہے اس میں بش کی حمایت صرف ۱۳ فیصد ہے۔ ۸۶ فیصد نے اس سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے۔ کلنٹن کے زمانے میں پورا لاطینی امریکہ، امریکہ کے ساتھ تھا، صرف ایک کیوبا خلاف تھا۔ آج معاملہ یہ ہے کہ لاطینی امریکہ کے پانچ ممالک کے اندر جو نئی قیادت آئی ہے وہ امریکہ مخالف ہے اور دوسری جانب پرانے یورپ اور نئے یورپ کی بحث اٹھائی گئی ہے۔

میں کہنا چاہتا ہوں کہ عالمی حالات تبدیل ہو رہے ہیں۔ تبدیل ہوتے حالات میں عالمی رائے عامہ کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔ اقوام عالم کا مطلب اب محض حکومتیں نہیں،

اقوام عالم کے معنی عوام ہیں اور ان عوام نے ابھی پرسوں، اٹھارہ تاریخ کو عراق پر حملے کے خلاف دنیا کے گوشے گوشے میں احتجاج کیا ہے۔ یہ ہے دنیا، دنیا وہ نہیں جو بش کہہ رہا ہے۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ اکیلی سپر پاور کے مقابلے میں اب طاقت کا مربوط دائرہ تشکیل پا رہا ہے اور جب تک ہم اس سے اپنا تعلق ٹھیک نہیں کرتے ہم بدلتے حالات کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے۔

امریکہ سے تعلقات توڑنے یا بگاڑنے کی بات کوئی نہیں کرتا لیکن اپنے لیے جگہ بنائیے اور لچک پیدا کیجیے اور طاقت کے جو دوسرے مراکز ہیں ان سے اپنے تعلقات استوار کیجیے تاکہ ہمارے مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ہماری فارن پالیسی پر نظر ثانی ہو۔ اس میں سر فہرست دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں شرکت ہے۔ ایک نکتہ ارتکاز امریکہ نے طے کیا ہے وہی ہم نے اپنا لیا ہے، اسے ختم کیجیے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ نہیں یہ ایک دہشت انگیز جنگ ہے جس سے دنیا کے سارے ممالک کو دہشت زدہ کیا جا رہا ہے۔ ہم اس میں بش کے حلیف بنے ہوئے ہیں جبکہ پوری دنیا کے ممالک اور باشعور لوگ اس سے دور جا رہے ہیں۔ خدا کے لیے جس تباہی کی طرف امریکہ جا رہا ہے، اس میں آپ شریک نہ ہوں۔

میرے پاس بہت زیادہ مواد ہے۔ گارڈین نے ابھی لکھا ہے کہ کسی امریکن صدر نے امریکہ کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا بش نے پہنچایا۔ نیو یارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ اور لاس اینجلس ٹائمز کے ایڈیٹوریل ہیں، یہی ساری چیزیں وہاں موجود ہیں۔ خدا کے لیے آنکھیں کھولیے اور بش کے ساتھ اپنی قسمت کو اس طرح وابستہ نہ کیجیے۔ بش کے ساتھ تو اس وقت خود امریکی عوام نہیں ہیں نہ ہی دنیا کے عوام اس کے ساتھ ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ ایک مبہم عنوان ہے اس جال میں ہمیں نہیں پھنسنا چاہیے بلکہ ہمیں اپنی ایک رائے قائم کرنا چاہیے۔ میں مانتا ہوں کہ ۹/۱۱ کے بعد آپ کی صورت حال بڑی نازک تھی۔ یہ بھی یاد دلاؤں کہ رینڈ کارپوریشن کی رپورٹ کے اندر انہوں نے صاف لکھا کہ جنرل پرویز

مشرف نے آزاد مرضی سے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔

اس کے پاس دوسرا راستہ نہیں تھا اور ہم نے اسے کہہ دیا تھا کہ یا تو تم ہمارے ساتھ ہو یا دہشت گردوں کے ساتھ ہو۔ طالبان کی مخالفت کرو یا پھر ہم تمہارے ساتھ طالبان جیسا معاملہ کریں گے۔

یہ الفاظ ہیں اس کے۔ ہمیں اب اس صورت حال سے نکلنا چاہیے۔ یہ بڑی بد قسمتی ہے کہ دنیا بدل گئی ہے، حالات مسلسل تبدیل ہو رہے ہیں اور آپ آنکھیں بند کر کے اسی طرف لگے ہوئے ہیں۔

تبدیلی کی جہات کیا ہوں: اس مجموعی تناظر میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف جنگ کا جو ایک نکاتی ایجنڈہ ہے اس کو ختم کیجیے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہمیں چین کے ساتھ تزویراتی تعلقات بڑھانے ہیں جو الحمدللہ بہت اچھے رہے ہیں اور اس کی کوشش اس حکومت نے بھی کی ہے۔ لیکن ہمیں سمجھنا چاہیے کہ مستقبل میں ہمارا مفاد چین کے ساتھ موجود ہے امریکہ کے ساتھ نہیں۔ امریکہ کا مفاد بھارت کے ساتھ ہے اور یہ کہنا کہ بھارت کی بنیاد پر پالیسی نہ ہو یہ سب Cliche ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ٹھیک ہے ہماری پالیسی پاکستان کی بنیاد پر ہونی چاہیے لیکن جاننے اور سمجھنے ضرورت ہے کہ پاکستان کے پڑوس میں اصل خطرہ کہاں سے ہے۔ اپنے تضادات کو دیکھیے کہ جنرل پرویز مشرف صاحب اسی انٹرویو میں جہاں یہ کہتے ہیں بھارت کی بنیاد پر پالیسی نہیں ہونی چاہیے۔ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ جہاں تک فوج کا تعلق ہے، فوج کا سارا نظام بھارت کی بنیاد پر ہی ہو گا۔ تو کیا فارن پالیسی اور ڈیفنس پالیسی الگ الگ ہو سکتی ہیں؟ یہ تضادات ہیں، یہ ہمیں دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ میں صاف کہنا چاہتا ہوں ہماری جو تزویراتی شراکت ہماری چین کے ساتھ اور ان ممالک کے ساتھ ہے جو اگرچہ اس وقت دنیا میں فاصلے پر ہیں لیکن موجودہ حالات میں ہم انہیں قریب لا سکتے ہیں۔ وہ یورپ میں بھی ہیں، لاطینی امریکہ میں بھی ہیں اور وہ مسلم دنیا میں بھی ہیں۔ ہمیں ان سے اپنے تعلقات استوار کرنے ہیں، یہ ہمارے لیے حفاظتی والو (Valve) ہو گا۔

داخلی محاذ پر توجہ: اگلی بات یہ ہے جناب والا! آپ ان حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتے جب تک کہ آپ اپنے گھر کو ٹھیک نہ کریں۔ خارجہ پالیسی کا بڑا تعلق داخلی صورتحال سے ہوتا ہے۔ داخلی صورتحال میں، میں کم از کم دو چیزوں کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ آپ نے قوم کو تقسیم کر دیا ہے، مجھے ڈر ہے کہ سول وار کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ وزیر داخلہ آفتاب شیر پاؤ نے تو بڑی زوردار تقریر کر لی ہے۔ لیکن حقیقتاً اس کا پیغام یہ ہے کہ ہم تبدیلی کے لیے تیار نہیں اور ہم سیکھنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ میں خراج تحسین پیش کرتا ہوں اپنے ساتھیوں کو کہ اس ایوان میں اس موضوع پر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان میں حکومت اور اپوزیشن دونوں کی اکثریت نے داخلی صورت حال کو سنجیدہ مسئلہ قرار دیا ہے۔ انہوں نے واضح کر دیا ہے کہ فوجی آپریشن نہیں چل پائے گا۔ چنانچہ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کو مذاکرات کا راستہ اختیار کرنا ہو گا، یہ نہیں ہو سکتا آپ ایک دم بندوق سینے پر لگا دیں، اس طرح مذاکرات نہیں ہوں گے۔ ہمیں اس کو بدلنا پڑے گا اور قومی اتفاق رائے اور حقیقی جمہوریت کی طرف جانا ہو گا۔ حقیقی جمہوریت جو دستور کے تحت ہونی چاہیے اسے آپ پروان چڑھائیں اور ساتھ ساتھ اقتصادیات کو ترقی دیں۔ ان خطرات کا، خاص طور بھارت، امریکہ اور اسرائیلی شراکت کا مقابلہ کرنے کے لیے جو داخلی استحکام اور طاقت ضروری ہے اس کے لیے ناگزیر ہے کہ اپنی قوم کو بیدار کریں اسے اعتماد میں لیں، معیشت کو ترقی دیں اور قوم میں اتفاق رائے پیدا کریں۔ حقیقی جمہوریت کو فروغ دیے بغیر ہم ان میں سے کوئی ہدف حاصل نہیں کر سکتے۔

افغانستان پالیسی: ساتویں چیز جناب والا! میں یہ کہوں گا کہ ہمیں اپنی افغانستان پالیسی پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ جس طرح ۲۰۰۱ء میں یوٹرن لیا گیا وہ ایک سانحہ تھا۔ لیکن اب ہر صورت میں اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ افغانستان اور ایران دونوں ہمارے لیے بڑے اہم ہیں۔ افغانستان سے ہمارے تعلقات میں ۱۹۸۷ء کے بعد سے جو مثبت جوہری تبدیلی آئی تھی ہم نے اس سب کو یک لخت ختم کر دیا ہے۔ میری نگاہ میں ہماری پالیسی افغانستان کے

معاملات میں عدم مداخلت ہونی چاہیے، اسی سے آپس میں اعتماد پیدا ہو گا۔ آپ نے جو کھیل کھیلا اس کا نتیجہ تباہ کن ہے۔

جب آپ نے ۹/۱۱ کے بعد امریکہ کا ساتھ دینے کا اعلان کیا تو کہا تھا کہ ہم نے یہ اس لیے کیا ہے کہ ہم اپنے تزویراتی اثاثوں کا دفاع کر سکیں ان اثاثوں میں آپ نے جوہری اثاثے، کشمیر اور افغانستان میں اپنا کردار شامل کئے تھے کہ افغانستان میں جو بھی کام ہو گا وہ طے شدہ ہدف کے مطابق ہو گا اور مختصر عرصہ میں ہو گا۔ صدر صاحب کے یہ الفاظ تھے کہ شمالی اتحاد کو کابل پر کنٹرول نہیں دیا جائے گا لیکن جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس ہے۔ اس لیے آپ کو سوچنا چاہیے کہ زمینی حقائق کیا ہیں؟ طالبان میں خامیاں بھی ہیں، خوبیاں بھی ہیں لیکن طالبان بھی پشتون ہیں اور افغانستان کے شہری اور وہاں کا حصہ ہیں۔ دوسری جانب وہ وہاں ایک طاقت بھی ہیں۔ اس لیے خدا کے لیے عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کیجیے تاکہ فی الحقیقت نیا اعتماد پیدا ہو سکے۔ ایسی پالیسی جس پر افغان بھی اعتماد کریں خواہ وہ پشتون ہوں، تاجک ہوں یا کوئی اور، اور خواہ وہ طالبان ہوں یا ان کے مخالفین۔ ہمیں اس میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں سب کو قبول کرنا چاہیے اور اس بنیاد پر ہمیں ان سے تعلقات استوار کرنے چاہییں۔

اسی طرح ایران کے ساتھ تعلقات کے حوالہ سے یہ بڑا نازک دور ہے۔ یہ وقت ہمت کا ہے۔ اگر امریکہ ایران پر حملہ کرتا ہے تو اس آگ سے پاکستان نہیں بچ سکتا۔ میری نگاہ میں وہ حملہ ایران پر نہیں پاکستان پر بھی حملہ ہو گا۔ اس کے لیے پیش بندی کرنے کی آج ضرورت ہے۔ اس لیے آپ کی خارجہ پالیسی کا جو جائزہ ہے اس میں اس پہلو کو خصوصاً آپ ذہن میں رکھیں۔

او آئی سی پر توجہ: پھر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی کانفرنس تنظیم کی جو کمزوریاں ہیں، وہ ہمارے سامنے ہیں، ان کمزوریاں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن اس دوران ایک راستہ اور ہے اور وہ ہے D-8 کو منظم کرنے کا۔ او آئی سی کے آٹھ ممالک جو تقریباً دنیا کی

آبادی میں سے ایک ارب بنتے ہیں، اور جو مسلم دنیا کے معاشی وسائل کے ایک بہت بڑے حصہ کی نمائندگی کرتے ہیں اگر ہم ان کی بنیاد پر آگے بڑھیں تو او آئی سی کا سفر بھی بہتر ہو گا۔ اسی طرح جس طریقے سے یورپ نے اپنی یونین کا عمل، پہلے چھ ممالک سے شروع کیا، پھر بارہ ہوئے اور اب ۲۵ تک پہنچ گئے ہیں۔ اس طرح ہم باقاعدہ آگے بڑھیں اور D-8 کی بنیاد پر اپنے آپ کو منظم کریں تو رفتہ رفتہ ایک مقابل قوت وجود میں آسکتی ہے۔

خارجہ پالیسی محض ردعمل نہیں ہوتی اس میں اگلے پانچ، دس سال بلکہ اس سے بھی آگے کے لیے سوچنا پڑتا ہے۔ خارجہ پالیسی کا جائزہ وقت کی ضرورت ہے اور غلط خارجہ پالیسی کا نتیجہ ہے کہ بش کے دورے سے ہماری کوئی غرض پوری نہیں ہوئی۔ انہوں نے ہمیں ہمارا قد دکھایا ہے۔ بتایا ہے کہ ہم جس طرح ان کی خدمت کر رہے ہیں وہ اسے کیسے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہماری کیا اوقات ہے، وہ انہوں نے ہمارے سامنے رکھ دی ہے۔ خدا کے لیے نوشتہ دیوار کو پڑھ لیجیے، اور اپنے حالات کی رو سے بات چیت کیجیے۔

یہ وہ نکات ہیں، جن پر میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اپنی پالیسی پر نظر ثانی کریں تو پھر اس بات کا امکان ہے کہ ہم ایک نیا پر عزم راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ راستہ جو عزت کا بھی ہو گا اور آزادی اور ترقی کا بھی ہو گا۔ بلاشبہ اس میں قربانیاں چاہییں، وقت چاہیے، لیکن میری نگاہ میں عزت کی زندگی کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ورنہ کیا ہو گا! میں ادب سے دعوت دوں کہ بش اور مشرف صاحب کی آخری پریس کانفرنس ٹی وی پر دیکھ لیجیے۔ میں نے اسے دیکھنے کی حماقت کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا صدر مجرم کی طرح کٹہرے میں کھڑا ہے۔ صورت حال کا یہ ایک اشاریہ ہے، لیکن موقع بھی ہے حالات کو بدلنے کا۔ آیئے ملک کے حالات کو بدلیں کہ ہمارے لیے یہی زندگی اور ترقی کا راستہ ہے۔

(۲۰ مارچ ۲۰۰۶ء)

گوانتاناموبے میں قرآن کی بے حرمتی
اور پاک امریکہ تعلقات

ممتاز امریکی جریدہ نیوز ویک نے ۳۰ر اپریل ۲۰۰۵ء کے شمارہ میں ایک امریکی اہلکار کے حوالہ سے رپورٹ شائع کی۔ اس اہلکار نے ایک سرکاری رپورٹ کی بنیاد پر، جو اس نے خود دیکھی تھی، انکشاف کیا کہ گوانتاناموبے میں امریکی تفتیش کار اور محافظ قیدیوں کے ساتھ تشدد اور توہین آمیز سلوک کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ زیر نظر مضمون اسی حوالہ سے پروفیسر خورشید احمد کی سینیٹ میں کی گئی تقریر پر مبنی ہے جس میں انہوں نے اس مخصوص نفرت آمیز امریکی اقدام کے مختلف پہلوؤں کا وسیع تر تناظر میں محاکمہ کیا ہے۔ اس وسیع تر تناظر میں پاک امریکہ تعلقات کی اہم جہت بھی زیرِ بحث آئی ہے۔

جناب چیئرمین! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ ایک نہایت اہم موضوع پر آج سینیٹ میں ہمیں گفتگو کرنے اور اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کا موقع مل رہا ہے۔ میں پوری دیانتداری سے آپ سے عرض کرتا ہوں کہ آج کا یہ موضوع میری لیے اپنی زندگی کے اہم ترین موضوعات میں سے ہے جن پر میں نے پچھلے ساٹھ سال میں اظہار خیال کیا ہے۔ یہ غیر معمولی اہمیت اس لیے ہے کہ یہ براہ راست ہمارے دین اور ایمان کا معاملہ ہے۔ کسی ذاتی یا جماعتی مفاد کا معاملہ نہیں ہے۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ یہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارے ایمان اور قرآن حکیم، جو اللہ کی آخری کتاب ہدایت ہے اس کی عصمت اور عزت کا معاملہ ہے۔ اس کے ساتھ کسی بھی دوسرے معاملہ کا موازنہ کرنا موزوں نہیں ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ موضوع تمام انسانوں اور خصوصیت سے تمام ہی مذاہب کے پیروکاروں کے لیے بھی اہمیت کا حامل ہے۔

قرآن پاک کے تقدس کی حفاظت: ایمان کا تقاضا

جناب والا! قرآن پاک نے ہمیں جو تعلیم دی ہے اس کے مطابق انسان کی بحیثیت انسان اور اللہ کے تمام انبیاء اور تمام کتابوں کا احترام اور ان کے تقدس کی حفاظت، ہمارے دین اور ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ قرآن پاک نے تو ہمیں یہاں تک حکم دیا ہے کہ جھوٹے خداؤں کو بھی برا نہ کہو، اگر کوئی گروہ جھوٹے خدا کو اپنا خدا مانتے ہیں تو اسے گالی دینا یا برے الفاظ سے پکارنا بھی غلط ہے۔ اس پس منظر میں میرے نزدیک قرآن مجید کی توہین پوری انسانیت کا معاملہ ہے۔ وہ تمام افراد جو اخلاقی اقدار، مذہب اور خدا پر یقین رکھتے ہیں اور جن کا تعلق انسانی حقوق اور مہذب معاشرے کی روایات اور ضروریات سے ہے انہیں اس پر آواز اٹھانی چاہیے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہوں گا کہ اس کا تعلق امن عالم سے بھی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ اگر اس کو اپنی حدود میں نہ رکھا جائے اور سب لوگ اس کا احترام نہ کریں تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ دنیا کے امن اور سلامتی کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ اس واقعہ پر دنیا بھر کے مسلمانوں نے کس طرح اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ افغانستان میں تو سولہ افراد نے جام شہادت نوش کیا ہے۔ یہ مسئلہ صرف ان سولہ افراد کا نہیں ہے بلکہ پوری دنیا کے مسلمان اپنے اللہ، اس کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی عصمت کے اوپر اپنی جان قربان کرنا اعزاز، فخر اور سعادت سمجھتے ہیں۔

یہ ناانصافی ہوگی اگر میں یہ بات نہ کہوں کہ اگرچہ یہ پہلی دفعہ نہیں ہوا لیکن جب ''نیوز ویک'' میں قرآن کی بے حرمتی کے اس واقعے کو پیش کیا گیا تو اسے ایک مرکزیت حاصل ہوئی ہے۔ پاکستان میں عمران خان اور ایم ایم اے نے اس پر فوری رد عمل کا اظہار

کیا۔ اس کے بعد پھر دوسری تمام جماعتوں نے، بشمول حکومت اور قومی اسمبلی نے اس پر قرارداد پاس کی۔ اس تسلسل میں یہ بات قابل اطمینان ہے کہ آج ہم سینیٹ میں بھی اس کے اوپر بات کر رہے ہیں۔

جناب والا! حقیقت یہ ہے کہ اس وقت پورے ملک کے مسلمان صرف دکھی ہی نہیں ہیں بلکہ امریکہ کے خلاف غیض وغضب کے جذبات محسوس کر رہے ہیں۔ اس وقت امریکہ کے بارے میں جو غصہ بلکہ نفرت دنیا بھر میں رونما ہو رہی ہے اور رائے عامہ کے سارے جائزے اسے بیان کر رہے ہیں، اس کی بنیادی وجہ ایسے ہی واقعات ہیں۔ اپنے استعماری مقاصد اور ساری مہذب دنیا کے علمبر دار ہونے کے دعووں کے ساتھ امریکی فوجی، امریکی دانشور حتّٰی کہ امریکی صدر اور ان کی ٹیم جو رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں اور جو الفاظ استعمال کر رہے ہیں اس سے لوگوں کے دل چھلنی ہیں۔ اور یہ وہ چیز ہے جو آگ کی طرح پھیل رہی ہے۔

بے حرمتی کے واقعات کی حقیقت اور شہادتیں

جناب والا! اس صورت حال میں سب سے پہلی بات میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ کے آزادی صحافت کے اپنے سارے دعوؤں کے باوجود وائٹ ہاؤس نے ''نیوز ویک'' پر اپنے اثرات استعمال کیے اور کوشش کی کہ اس رپورٹ کو واپس لیا جائے۔ لیکن اس کی جو تفصیل ''نیوز ویک'' نے اپنے اگلے شمارے میں دی ہے وہ غور کرنے کے لائق ہے اور اس سے یہ بات دو سو فیصدی ثابت ہو جاتی ہے کہ جو واقعات ہوئے ہیں وہ حقائق پر مبنی ہیں۔ جریدے نے اپنی خبر کی کوئی تردید نہیں کی بلکہ اس رپورٹ کے اندر سب سے پہلے یہ بتایا کہ ایف بی آئی کی نگرانی میں پچھلے دو سال سے ایک نہیں متعدد واقعات اس سلسلے کے موجود ہیں۔

پھر 'نیوز ویک' نے یہ بتایا کہ جون بیری جو امریکہ کا ایک سینئر قانون داں اور وکیل

ہے، وہ گوانتاناموبے کے مختلف محصورین کے مقدمے لڑ رہا ہے۔ اس وقت اس کے پاس تیرہ قیدیوں کے مقدمات ہیں۔ اور اس کے بقول ایک بنیادی چیز جو تمام قیدیوں نے کہی ہے وہ قرآن پاک کی بے حرمتی ہے۔ درحقیقت صرف وہ تیرہ قیدی ہی نہیں بلکہ اس کی روایت کے مطابق گوانتاناموبے میں قید ۲۳ حضرات نے اس واقعے پر خودکشی کی دھمکی دی۔ یہ تمام چیزیں ریکارڈ پر موجود ہیں۔ اس کے بعد پھر جس نمائندے نے یہ رپورٹ پیش کی تھی اس نے بیان دیا ہے کہ جس ذریعے سے میں نے یہ معلومات حاصل کی تھیں۔ میں نے اس ذریعہ سے دوبارہ چیک کیا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے لازماً یہ چیز دیکھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ساؤتھ کمانڈ کی رپورٹ میں نہ ہو اور دوسری رپورٹ کے اندر ہو لیکن لازماً یہ وہاں پر موجود ہے۔ مارک ڈی فالکوف ایک اور امریکی ہے اس نے بھی اس سلسلے میں جتنے مقدمے لڑے ہیں سب میں بتایا ہے کہ جو شکایات ان کو ملی ہیں ان میں اذیت رسانی، جنسی بے حرمتی اور ان سب کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کی بے حرمتی بھی اس کا ایک حصہ ہے۔

''نیوز ویک'' کی ۲۳ مئی ۲۰۰۵ء کی ہی رپورٹ کے اندر افغانستان کے قیدیوں کی شہادت کی خبر موجود ہے اور خاص طور پر ہمارے اپنے صحافی بدر الزمان نے جو اپنا انٹرویو دیا ہے اس کی پوری تفصیلات اس رپورٹ کے اندر آئی ہیں۔ ان ساری گواہیوں کے بعد ایک بڑی اہم گواہی ہے جو بین الاقوامی ریڈ کراس نے غالباً تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنی خاموشی توڑ کر دی ہے۔ ریڈ کراس کے نمائندے نے سرکاری طور پر یہ بات کہی ہے کہ ہم دو سال سے امریکی حکومت کو اپنی رپورٹ سے متوجہ کر رہے ہیں کہ ہمارے پاس برابر قرآن پاک کی بے حرمتی کی معلومات آ رہی ہیں۔ اس کے ساتھ امریکہ کے ''نیویارک'' میں قائم ادارے ہیومن رائٹس واچ نے اپنی رپورٹ میں یہ بات کہی ہے۔ عرب اخبارات کے اندر اور الجزیرہ ٹی وی میں انٹرویوز آئے ہیں۔ جبکہ ان اخبارات میں یمن، الجیریا اور افغانستان کے علاوہ دوسرے عرب قیدیوں کی گواہیاں بھی موجود ہیں۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ قرآن پاک کی بے حرمتی، جس میں قرآن پاک کو پھاڑنا، اس کو پھینکنا، اس کو اپنے جوتوں سے

روندنا اور اسے بیت الخلاء میں ڈالنا، یہ تمام چیزیں ان گواہیوں سے ثابت ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہت گھناؤنی، شرمناک اور اشتعال انگیز حرکت ہے اور اس کے کرنے والے امریکی فوجی تفتیشی افسران ہیں۔ حتّٰی کہ ان افسران میں کمانڈرز بھی شامل ہیں۔ اس سارے معاملے میں تین چار ایسے مقامات آتے ہیں جہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جب گوانتاناموبے کے ان قیدیوں نے کھانا کھانے سے انکار کیا اور خودکشی کی دھمکی دی تو چند کمانڈروں نے معذرت کی۔ لیکن معذرت کے بعد پھر برابر وہی حرکتیں ہوتی رہی ہیں۔

اس لیے پہلی چیز میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تسلیم شدہ حقائق ہیں۔ لیکن اگر اس بارے میں کسی قسم کا کوئی شبہ کسی جانب سے اٹھایا جاتا ہے، جو کہ میری نگاہ میں نہیں ہے، تو اس کے لیے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ بین الاقوامی سطح پر غیر جانبدارانہ اعلیٰ اختیاراتی تحقیقات کی جائیں۔ جناب والا! مجھے آپ کے ہاں کھانے کے موقع پر امریکی نائب وزیر خارجہ کرسٹینا روکا سے بات کرنے کا موقعہ ملا، میں نے اس سے سب سے پہلی بات یہی کہی۔ جواباً خاتون نے خالصتاً امریکی انداز میں یہ کہا کہ ''نیوز ویک'' نے تو اس کی تردید کر دی ہے۔ میں نے سوال کیا کہ آپ نے وہ تردید پڑھی ہے؟ اور اسے بتایا کہ میں نے نیوز ویک کی یہ تردید پڑھی ہے اس سے تو پورے معاملہ کی تائید ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ امریکہ کا وقار بحال ہو اور اس معاملے میں کوئی اعتماد پیدا ہو تو اس کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آزاد تحقیقات ہوں۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا ہے کہ ایسی آزادانہ تحقیقات میں کم از کم تین جج مسلمان ہونے چاہییں تاکہ ہمیں اعتماد کے ساتھ معلوم ہو سکے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

جو کچھ ہوا ہے وہ میری نگاہ میں اس اعتبار سے بھی بڑی گھناؤنی حرکت ہے کہ قرآن پاک کی صرف بے حرمتی نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ بے حرمتی ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اقوام متحدہ کے چارٹر، انسانی حقوق کے عالمی

اعلامیہ اور اقوام متحدہ کے کنونشن، ان سب کی رو سے ہر انسان کے حقوق ہیں جن کی یہ خلاف ورزی ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اسلام نے تو اس معاملے میں یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے دنیا میں آنے کے مقاصد میں سے ایک مقصد انسانوں کے درمیان انصاف تھا۔

لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (الحدید ۵۷:۲۵)

تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

تمام انسانوں کے درمیان انصاف کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے مسلمان فقہاء، خصوصیت سے امام ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ انصاف ہر مقام پر اور ہر انسان کے ساتھ حتٰی کہ غیر مسلم دشمن کے ساتھ بھی ضروری ہے۔ یعنی انصاف سب کے ساتھ برابر کا ہونا چاہیے۔ قرآن مجید نے یہی پیغام اس صورت میں دیا ہے کہ ناحق انسان کی جان لینا، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، پوری انسانیت کو قتل کرنے کے مترادف ہے اور ایک انسان کی جان بچانا، پوری انسانیت کو بچانے کے برابر ہے۔ یہی وہ اصول ہے جس پر امن اور انصاف قائم ہو سکتا ہے۔

امریکہ کے جرائم

میں دکھ سے کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ نے جو پالیسی اپنی رعونت کے تحت اختیار کی ہے وہ انسانی حقوق کا کلی طور پر عدم احترام ہے۔ یہ بین الاقومی قانون کی کلی بے حرمتی ہے۔ اذیت رسانی کو ایک قابل قبول عمل کے طور پر اختیار کیا گیا ہے اور جناب والا! میرے پاس ساری دستاویزات ہیں جو اب اطلاعات کی آزادی کے تحت قابل حصول ہیں۔ مجھے اجازت دیں کہ حوالے کے ساتھ آپ کو بتاؤں کہ ۲۰۰۲ء میں امریکی وزیر دفاع رمز فیلڈ نے جو ہدایات جاری کیں، ان میں یہ بات کہی گئی ہے کہ لوگوں سے اپنی بات اگلوانے کے لیے آپ قوت استعمال کر سکتے ہیں اور جسمانی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ تشدد کو بطور پالیسی ہتھیار پیش کیا گیا لیکن میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس سے بھی آگے بڑھ کر تین

باتیں اس میں نام لے کر کہی گئی ہیں اور ان تینوں کا تعلق مسلمانوں کے ایمان، ان کی روایات اور ان کی تہذیب سے ہے۔

پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ اس کام کو کرنے کے لیے آپ ان قیدیوں کی داڑھیاں مونڈ سکتے ہیں۔ جی ہاں! وہاں یہ الفاظ موجود ہیں کہ آپ ان کی داڑھیاں مونڈ سکتے ہیں۔ داڑھی اللہ کے رسول ﷺ کی سنت ہے اور مسلمان کی شناخت ہے۔ یہ ہمارے ایمان کا معاملہ ہے لیکن ہدایات میں کہا گیا ہے کہ اس ہتھیار کو بطور تشدد کوئی بات اگلوانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ ان کو برہنہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس میں الفاظ لکھے ہیں کہ جو چیز بھی پہنی ہے، اسے اتارا جائے۔ تیسری بات یہ ہے کہ مسلمان چونکہ کتے سے نفرت کرتے ہیں اس لیے کتوں کو بھی اس کام کے لیے استعمال کیا جائے۔ یہ تین چیزیں اس میں نام لے کر کہی گئی ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ تشدد اور ذہنی اذیت کو بطور آلہ استعمال کرنا امریکہ کی پالیسی ہے اور یہ پالیسی باقاعدہ استعمال ہوتی رہی ہے۔ یہ بہت بڑا جرم ہے جو امریکہ نے کیا۔

اس کے بعد جناب والا! جتنی معلومات ہمارے پاس آ رہی ہیں جس میں امریکی اور برطانوی اخبارات میں شائع ہونے والی ایک نہیں درجنوں مثالیں موجود ہیں، ان کے مطابق یہ گھناؤنے اقدامات کیے جاتے ہیں اور ان کو چھپایا جاتا ہے۔ جھوٹ اور دھوکا امریکہ کی خارجہ پالیسی کا ایک بنیادی اصول بن گیا ہے۔ عراق پر حملہ صریحاً جھوٹ کی بنیاد پر ہوا ہے اور یہ جانتے ہیں کہ وسیع پیمانے پر تباہی کے ہتھیاروں کی تیاری کا ان کا لگایا ہوا الزام صریحاً غلط ہے۔ اس ضمن میں آج تو ساری گواہیاں موجود ہیں، بین الاقوامی جوہری توانائی کمیشن سے لے کر امریکہ کی اپنی تمام رپورٹس واضح کرتی ہیں کہ بش اور رمز فیلڈ کو یہ معلوم تھا کہ ان کے پاس اس بنیاد پر حملہ کرنے کے لیے کوئی جواز موجود نہیں لیکن پھر بھی حملہ کیا گیا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ میں کس طرح اس مسئلے پر بحث ہوئی ہے اور اسے بے نقاب کیا گیا ہے۔

جناب والا! اس کے ساتھ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ حقائق کو چھپانے کا یہ عمل بھی امریکہ کی پالیسی کا ایک حصہ ہے۔ اس ضمن میں دو تین مثالیں دے کر میں واضح کرنا چاہوں گا۔ ''نیوزویک'' کے معاملے میں رپورٹ کو واپس لینے کے لیے جو کچھ ہوا، یہ کوراپ (Cover-up) ہے۔ اس کے بعد پھر آپ یہ دیکھیے کہ بڑا اہم واقعہ ابھی ہمارے سامنے آیا ہے کہ فٹ بال کا ایک امریکی ہیرو جو افغانستان میں اپنے بھائی کے ساتھ گیا، اسے وہاں امریکی فوجیوں نے مارا۔ اب یہ بات سرکاری دستاویزات میں بھی آگئی ہے کہ اسے امریکی فوجیوں نے مارا ہے اور یہ بات وہاں پر امریکہ کے سفیر ہی کو نہیں بلکہ امریکہ کے سپریم کمانڈر کے علم میں بھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہا گیا کہ اسے طالبان نے مارا ہے۔ ابھی چند روز قبل جو کچھ بگرام میں ہوا اس کی تفصیلات ایک ہفتے پہلے نیوزویک/ٹائم اور ہیرالڈ ٹریبیون نے دی ہیں۔ یہ سب اس قدر شرمناک ہے کہ اس پر افغانستان کے صدر حامد کرزئی کو بھی یہ کہنا پڑا کہ میں امریکہ جارہا ہوں اور میں جا کر کہوں گا کہ بگرام میں کس طرح ہمارے قیدیوں کو امریکیوں نے تشدد کر کے مارا اور اس کے بعد کوراپ (Cover-up) کیا گیا ہے۔

میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ انگلستان میں بھی ڈاکٹر کیلی (Dr. David Kelly) کا واقعہ ہوا جس نے یہ بات کی تھی کہ عراق کے بارے میں جو معلومات ہیں یہ سب جھوٹ ہیں۔ ان میں کوئی حقیقت نہیں لیکن اس شخص کو ڈرا دھمکا کر اتنا دہشت زدہ کیا گیا کہ اس نے پھر خودکشی کرلی۔ خودکشی کے بعد جو وجوہات سامنے آئیں ان سب میں یہ بات آئی ہے کہ کوراپ (Cover-up) کی بنا پر وہ غیر معمولی دباؤ کا شکار تھا۔

سات نکاتی چارج شیٹ: جناب والا! ان حقائق کی روشنی میں، میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اجازت دیں کہ اس پورے معاملہ کو میں آج امریکہ کے خلاف قرآن پاک کی بے حرمتی کے حوالہ سے فرد جرم یا چارج شیٹ قرار دوں۔

- اس چارج شیٹ میں ہمارا پہلا نکتہ یہ ہے کہ خود گوانتاناموبے کا وجود انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے۔ یہ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ آپ نے کیوبا کے

ایک حصے کو دنیا کے ہر قانون، حتٰی کہ امریکہ کے آئین کی دسترس سے باہر قرار دے دیا ہے۔ یہاں آپ جان بوجھ کر لوگوں کو لاتے ہیں، ان پر تشدد کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے پنجروں میں رکھتے ہیں۔ یہاں چوبیس گھنٹے لوگوں کو محبوس رکھا جاتا ہے اور ان کی بے عزتی کی جاتی ہے۔ یہ سارے کا سارا کام بین الاقوامی قوانین ہی نہیں بلکہ امریکہ کے آئین سے بھی باہر رکھا گیا ہے۔ رمز فیلڈ نے کھلے بندوں یہ بات کہی کہ وہ تمام افراد جو مشتبہ ہیں انہیں شبہ کی بنیاپر آپ یہاں لے آئیں، پھر نہ انہیں یہ حق ہے کہ ان کے اہل خانہ ان کو ملیں اور نہ ہی یہ پتا ہے کہ کب تک انہیں بغیر مقدمہ چلائے جیلوں میں رکھا جاتا ہے۔

تین ہزار سے زیادہ افراد گزشتہ چھ سالوں میں گوانتاناموبے میں لائے گئے ہیں اور پچھلے سالوں میں صرف ۳۸ کا مقدمہ چلا ہے۔ ان ۳۸ میں سے ۲۰ معصوم قرار پائے اور انہیں چھوڑنا پڑا ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ ۳ ہزار میں سے صرف ۳۸ پر نظام انصاف آزمانے کی کوشش کی گئی اور ان ۳۸ میں سے بھی ۲۰ کے خلاف آپ کوئی چیز نہیں لا سکے۔ درحقیقت جن کے خلاف کوئی چیز لائے وہ بھی الٹی سیدھی ہیں اور ان لوگوں کو اپنے دفاع کا اختیار بھی نہیں ہے۔ حالانکہ اب امریکہ کی ایک کورٹ نے بھی یہ کہا ہے کہ گوانتاناموبے کے یہ قیدی اپنا وکیل کر سکتے ہیں لیکن عملاً انہیں یہ سہولت ابھی تک میسر نہیں ہے۔

گوانتاناموبے کا وجود انسانیت کے خلاف ایک قبیح جرم ہے، جس میں آپ نے قانون کے سارے تصورات کو بدل دیا ہے۔ قانون کی بنیاد یہ ہے کہ ہر شخص معصوم ہے جب تک کہ جرم ثابت نہ ہو جائے۔ آپ نے اسے الٹا کر کے یہ کر دیا ہے کہ جس پر آپ کو شبہ ہو وہ مجرم ہے حتٰی کہ وہ اپنی معصومیت ثابت نہ کر دے۔ یہ جو پورے کا پورا الٹ پھیر ہے یہ انسانیت کے خلاف ایک بڑا جرم ہے۔

- جناب والا! اگلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام

پر جو حرکتیں ہو رہی ہیں، یہ بین الاقوامی دہشت گردی کی ایک بدترین مثال ہے۔ کسی کو یہ اختیار نہیں کہ آزاد اور خود مختار ممالک پر محض ان مفروضوں کی وجہ سے کہ ان کی پناہ میں کوئی چھپا ہوا ہے فوج کی لشکر کشی کریں۔ افغانستان کو آپ نے تباہ کر دیا۔ تین ہزار افراد جنہیں ٹوئن ٹاورز میں (۹/۱۱ کے واقعہ میں) ہلاک کیا گیا ہم نے اس کی بھی کھل کر مذمت کی ہے۔ تمام دنیا کی اسلامی تحریکات اور مسلم دنیا کی تمام حکومتوں نے اس کی مذمت کی ہے۔ اس کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔

میں نے کرسٹینا روکا سے ملاقات میں یہ بات بھی کہی تھی کہ ۹/۱۱ کے واقعات میں ہلاک ہونے والے ان تین ہزار میں چالیس ممالک کے افراد تھے اور ان میں سے بیس مسلمان ملکوں سے تھے۔ ہم اسے کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں! لیکن اس المیہ کے نام پر افغانستان اور عراق میں لاکھوں معصوموں کو مار دینا، یہ بدترین دہشت گردی ہے۔ درحقیقت آپ کی یہ ساری سرگرمی بلاجواز ہے اور اس کی وجہ سے آپ نے پوری دنیا کو دہشت زدہ کر دیا ہے۔ ہم نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ یہ جنگ کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ آج خود بش اور رمز فیلڈ اعتراف کر رہے ہیں کہ ہمیں کچھ پتا نہیں کہ یہ کب تک چلے گی۔ اسی طرح ٹونی بلیئر نے بھی کہا ہے کہ پتہ نہیں کب تک یہ جنگ چلے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ دراصل پوری انسانیت کے خلاف ایک جنگ ہے اور یہ چارج شیٹ کا دوسرا نکتہ ہے۔

- جناب والا! تیسرا چارج ہمارا یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے ہمنواؤں نے انسانی حقوق کے چارٹر، جنیوا کنونشن اور متعدد بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اس معاملہ میں بدقسمتی سے ہمارا بھی کچھ دخل ہو جاتا ہے۔ ایک نئی چیز یہ کی گئی ہے کہ کسی شخص کو مقدمہ چلائے بغیر اور یا کم از کم اس کی غلطی یا جرم ثابت کیے بغیر دوسروں کے حوالے کر دیا جائے۔

آپ کو معلوم ہے کہ بین الاقوامی قانون کے اندر ہجرت اور پناہ گیری ایک تسلیم شدہ اصول ہے اور اس کے باقاعدہ قواعد وضوابط ہیں۔ یہ غنڈہ گردی ہے کہ آپ جس کو چاہیں پکڑ لیں اور امریکہ کہے اور آپ اس کے حوالے کر دیں۔ اسی طرح انہوں نے ایک اور چیز کی ہے جو یہ ہے کہ امریکہ جن افراد کے بارے میں چاہتا ہے کہ کوئی دوسرے لوگ ان پر تشدد کریں تو ان کو وہ اپنے ایجنٹ قاتلوں، غاصبوں اور قصابوں کے ہاتھوں میں دے دیتا ہے۔ دسیوں افراد ایسے ہیں کہ جنہیں پاکستان سے لیا گیا ہے یا افغانستان سے پکڑا گیا ہے اور اس کے بعد مصر، الجیریا، یمن جیسے ممالک میں بھیج دیا گیا کہ وہاں پر جو چاہیں ان کے ساتھ سلوک کر لیں۔ بلاشبہ یہ بھی انسانیت کے خلاف ایک بڑا جرم ہے۔

- جناب والا! ہمارا چوتھا نکتہ یہ ہے کہ عالمی دہشت گردی کے نام پر خواہ وہ فوج کشی ہو، قتل وغارت گری ہو، بلاثبوت گرفتاریاں ہوں، بلامقدمہ حراست ہو یا ٹارچر ہو، یہ سارے جرائم دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی اس نام نہاد جنگ میں مسلسل جاری ہیں۔
- جناب والا! پانچویں چیز میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انسانی تاریخ میں قیدیوں پر تشدد اور اذیت دینے کا عمل (Torture) تو ہمیشہ سے رہا ہے۔ ظالموں کا یہ حربہ تاریخ کے ہر دور میں اور مختلف ممالک میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ہے لیکن مذہب، مذہبی اقدار، مذہبی احساسات اور مذہب کی علامتوں کو ٹارچر کے لیے استعمال کرنا یہ امریکہ کی جدید تہذیب کا اضافہ ہے۔ چنانچہ ہماری چارج شیٹ کا پانچواں نکتہ یہ ہے کہ ٹارچر کو مذہبی اقدار اور علامتوں کے ذریعے بھی استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں توہین انبیاء اور مذہبی کتب کے بارے میں آج تک طرز عمل یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، انبیاء اکرام، دینی کتب اور دینی شخصیات کے بارے میں نازیبا باتیں نہ کی جائیں۔ لیکن اب توہین انبیاء اور مذہبی

کتب کی بے حرمتی کا نیا انداز اور طریقہ آیا ہے جس میں انہیں تشدد کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

- جناب والا! میرا چھٹا چارج یہ ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو دراصل اسلام کے خلاف جنگ بنایا جارہا ہے اور یہ بڑا ہی سنجیدہ مسئلہ ہے۔ جناب والا! یہ بات میں آپ سے پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ وقت کی قلت کی بنا پر میں یہاں ساری شہادتیں پیش نہیں کر سکتا لیکن اشارتاً عرض کرتا ہوں کہ امریکی صدر بش نے دو بار بطور نظریہ صلیبی جنگ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ پہلی بار صلیبی جنگ استعمال کرنے کے بعد معذرت کی کہ وہ غلطی سے کہہ گئے تھے لیکن دوبارہ پھر یہی الفاظ استعمال کیے۔ یہ دراصل غلطی نہیں بلکہ اصل عزائم کا اظہار ہے، اسے فریب کاری کہتے ہیں، یہ ان کی زبان سے یوں اچانک ہی ادا نہیں ہوا ہے۔

نائن الیون کے فوراً بعد قدامت پسندوں (Neocons) کا وہ گروپ جس کی جناب بش صاحب کو تائید حاصل ہے ،ان کی ایک چوٹی کی دانشور این کولٹر (Ann Hart Coulter) نے امریکہ کے قدامت پسند میڈیا میں مضمون لکھا ہے۔ یہ مضمون ان کے ایک اہم جریدے نیشنل ریویو میں شائع ہوا ہے جس کی حیثیت نیوزویک اور ٹائم کی طرح ہے۔ اس مضمون سے میں آپ کو ایک جملہ سناتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہو گا کہ ان کی سوچ اور ہدف کیا ہے۔ مضمون نگار یہ کہتی ہے کہ ہمیں ان کے ممالک میں گھس کر ان کے لیڈروں کو قتل کر کے انہیں عیسائی بنانا ہو گا۔ یہ اس کے الفاظ ہیں۔

اگر آپ ۹/۱۱ کمیشن کا مطالعہ کریں، ۶۰۰ صفحات کی اس رپورٹ کو میں نے حرف بحرف پڑھا ہے۔ اصل مسئلے کے بارے میں تو اس رپورٹ کا بمشکل ۲۰ فیصدی حصہ بحث کرتا ہے، باقی ساری کی ساری رپورٹ ان کی جانب سے لگائے گئے الزامات پر مبنی ہے۔ میری نگاہ میں اس کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں بدقسمتی سے پاکستان

اور ہمارے جنرل [مشرف] صاحب کا نام بھی موجود ہے۔ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ ہمارا ہدف صرف دہشت گرد یا صرف اسلامی دہشت گرد ہی نہیں بلکہ ہمارا ہدف وہ ڈھانچہ/تنظیمات ہیں جن سے [ان کے خیال میں] امریکہ کے خلاف ذہن پیدا ہو رہا ہے۔

جناب والا! میں پھر بہت دکھ سے یہ بات کہتا ہوں کہ اس تحریر میں مسلمانوں کی تین نہایت مقدس شخصیات، امام ابن تیمیہ، محمد بن عبدالوہاب اور سید قطب کا نام لیا گیا ہے کہ یہ وہ حضرات ہیں جو جہاد کا جذبہ پیدا کرنے والے ہیں اور کہا گیا ہے کہ یہ ہمارا ہدف ہیں۔ یہ سرکاری رپورٹ ہے۔ لیکن میری نگاہ سے کم از کم دو درجن سے زیادہ کتابیں جو پچھلے تین سالوں میں آئی ہیں، گزری ہیں اور یہ سب امریکی دانشوروں کی لکھی ہوئی ہیں اور ان سب سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ دہشت گردی عنوان ہے، حقیقت میں ہدف اسلام کے خلاف فوج کشی بلکہ تہذیبی، فکری اور عملی یلغار ہے۔ اور جہاں کہیں اسلام کی جانب سے مزاحمت کا امکان ہے اسے ہدف بنانا ہے۔ امریکی بالادستی، اس کی چودھراہٹ اور امریکی سامراج کی مزاحمت کرنے والوں کو ختم کرنا ہے۔ اور یہ ہدف صرف امریکہ تک محدود نہیں ہے۔

جناب والا! میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اٹلی کے وزیر اعظم نے بھی کھل کر یہ بات کہی کہ اسلام ہمارا دشمن ہے۔ ڈنمارک کی ملکہ کی سوانح عمری 'Margrethe II' آئی ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ بین الاقوامی اسلام سے ہمارا مقابلہ ہے اور ہم نے اسلام سے بہت رعایت برتی ہے کہ ہم نے آج تک اس کا سر نہیں کچلا۔ اب ہمیں اس کا فی الفور مقابلہ کرنا چاہیے۔

اس لیے جناب والا! ہمیں سمجھنا چاہیے کہ معاملہ صرف دہشت گردی یا صرف قرآن کی بے حرمتی نہیں ہے، یہ سب ایک وسیع تر سازش کا حصہ ہے اور اس وقت اس کا ہدف اسلام ہے۔ اس کے لیے انہوں نے نئی اصطلاحات وضع کر لی ہے کہ

ایک اسلام 'انتہا پسند' ہے، جبکہ ایک 'اعتدال پسند' اسلام ہے۔ اعتدال پسند اسلام وہ ہے کہ جو نہ اسلامی قانون پر ایمان رکھے اور نہ ہی اسلامی اقدار پر یقین کرے۔ جو امریکہ اور جارج بش کہیں اس کی ہاں میں ہاں ملا لیں، یہ ان کے مطابق 'اعتدال پسند' اسلام ہے۔ لیکن میں واضح طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ در حقیقت ایسا کوئی اسلام موجود نہیں ہے۔ اسلام اسلام ہے، جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا اسلام ہے، ہم سب اسی پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارا یہی ایمان ان کا اصل ہدف ہے۔ یہ ہمارا چھٹا چارج ہے کہ دراصل آپ جس چیز کو دہشت گردی کے نام پر ہدف بنا رہے ہیں وہ اسلام ہے۔

- جناب والا! میرا ساتواں نکتہ یہ ہے کہ میری نگاہ میں صرف امریکہ ہی ان چھ چیزوں کا مرتکب نہیں ہو رہا ہے بلکہ امریکہ نے دنیا کے دوسرے ممالک کو بھی دہشت گردی کے ذریعے، دباؤ ڈال کر کے یا رشوت دے کر اس عمل میں اپنے ساتھ ملایا ہے۔ خواہ وہ اسپین ہو جو ایک ہی ضرب لگنے پر پیچھے ہٹ گیا اور خواہ وہ یورپ کے دیگر ممالک ہوں جو اس کے ساتھ مل گئے ہیں۔ لیکن اس میں سب سے شرمناک معاملہ یہ کہ بہت سے مسلمان ممالک نے بھی محض اس خوف سے گھٹنے ٹیک دیے ہیں کہ بش کے نمائندے نے یہ کہا ہے کہ یا تو ہمارے ساتھ ہوں یا ہمارے خلاف ہوں اور اگر تم نے اپنے مسلمان بھائیوں کو ذبح کرنے کی جدوجہد میں ہمارا ساتھ نہ دیا تو ہم تمہیں اس طرح نہیں چھوڑیں گے، ہماری فوج تمہیں کچل دے گی۔ انہوں نے جس 'ملزم' کے لیے بھی کہا کہ ہمیں بھیجو، ہم نے اس کو بھیجا۔ بدقسمتی سے ہماری قیادت بھی اس معاملہ میں تابعداری ہی کرتی رہی ہے۔

جناب والا! آپ کے پاس اس بات کا کیا جواز ہے کہ جس کے بارے میں امریکہ کہہ دے کہ ہمیں وہ مطلوب ہے، آپ اس کو اٹھا کر دے دیتے ہیں۔ کیا ہمارا کوئی وقار نہیں ہے؟ ہمارا اپنا کوئی قانون اور دستور نہیں ہے؟ کیا کوئی بین الاقوامی قانون

موجود نہیں ہے؟ آج ہی آپ نے پڑھا ہے کہ Abu Faraj al-Libbi (ابو فرج اللبی) ہم ان کے حوالے کر رہے ہیں، جبکہ دو ہفتے پہلے کہا گیا تھا کہ ہم حوالے نہیں کریں گے۔ آخر یہ کیا کھیل ہے؟

لیفٹیننٹ جنرل صفدر صاحب کا بھی جو بیان آیا ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ۶۹۰ کے قریب چیک پوسٹیں ہیں جن پر کہ ہم شمالی وزیرستان میں کام کر رہے ہیں۔ ابھی ۴۹ آپریشنز کیے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ان آپریشنز میں ہم نے ۳۵۰ دہشت گردوں کو مارا ہے، پتا نہیں وہ دہشت گرد ہیں یا نہیں تاہم وہ کہتے ہیں کہ جن کو ہم نے مارا ہے ان میں سے ۱۵۰ غیر ملکی تھے۔ لیکن جناب والا! جنرل صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ ان آپریشنز میں ۲۵۱ پاکستانی فوجی ہلاک ہوئے اور ۵۵۰ پاکستانی فوجی زخمی ہوئے ہیں۔ میں دکھ سے کہتا ہوں کہ جتنے امریکی افغانستان میں تین سال میں ایک کھلی جنگ میں نہیں مارے گئے اس سے زیادہ آپ نے اپنے فوجی اپنی زمین پر مروا دیے ہیں۔ یہ جو سلسلہ یا معاونت ہے جناب والا! آپ کو اسلامی تعلیمات کا یہ اصول معلوم ہے کہ مجرم تو مجرم ہے ہی لیکن مجرم کی اعانت کرنے والا بھی مجرم ہے۔(Abetment in crime is a crime) بدقسمتی سے ہم مجرم کی اعانت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

کیا کیا جائے؟

آخر میں جناب والا! میں آپ کو اس طرف متوجہ کروں گا کہ ہمیں کرنا کیا ہے؟

عالمگیر احتجاج: میں سب سے پہلے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ مؤثر عالمگیر احتجاج اور مزاحمت ہونا چاہیے۔ ہم محاذ آرائی نہیں چاہتے لیکن معاہدے یا مشروط اطاعت کے لیے بھی کوئی ابہام نہیں رکھنا چاہیے۔ مسلمان بے غیرت نہیں، ان کی عظیم تاریخ ہے، آج ہم کمزور ضرور ہیں لیکن نہ ہم بے ایمان ہیں اور نہ بے غیرت اور الحمدللہ ہم میں اتنی قوت ہے کہ ہم اپنے دین،

ایمان اور اپنی آزادی کی حفاظت کر سکیں۔ تاہم اس کی اہم ترین شرط یہ ہے کہ عوام اور حکومتوں کے درمیان بے اعتمادی نہ ہو۔ ایسے حکمران جن کے مفادات ملک اور امت مسلمہ سے باہر ہیں، ہمیں انہیں خود سے دور کرنا ہے۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ کیونکہ صرف وہ قوم جو اپنی عزت خود کرتی ہو، دنیا اس کی عزت کرے گی اور جو قوم اپنی عزت نہیں کرتی دنیا بھی اس کی عزت نہیں کرتی۔ چنانچہ ہم نے ان تمام چیزوں پر مؤثر احتجاج اور مزاحمت کرنا ہے۔

آزادانہ تحقیقات: جناب والا! دوسری چیز یہ ہے کہ آزادانہ تحقیقات ہونی چاہییں۔ اسلامی کانفرنس تنظیم (OIC) نے بھی اس معاملے میں کہا ہے اور میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ ۱۲ اپریل کو جنیوا میں جو اقوام متحدہ کمیشن برائے انسانی حقوق ہوا تھا اس میں تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک منفرد قرارداد پاس ہوئی ہے۔ اس قرارداد میں پہلی بار صرف انسانی حقوق کا ذکر نہیں ہوا بلکہ یہ بات وضاحت سے کہی گئی ہے کہ ۹/۱۱ کے بعد اسلام کے امیج کو بگاڑا (Devalorize) جارہا ہے۔ اسلاموفوبیا کو فروغ دیا جارہا ہے اور مسلمان کے ساتھ امتیاز برتا جارہا ہے۔ اس کا تدارک ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ ہر مذہب کے ساتھ برابر کا سلوک ہونا چاہیے۔ جناب والا! کیا میں آپ کو یہ بتاؤں کہ اس قرارداد کے حق میں ۳۱ ووٹ آئے ہیں اور اس میں سارے مسلمان ممالک اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک شامل ہیں۔ قرارداد کے خلاف ۱۶ ووٹ آئے ہیں جن میں سرفہرست امریکہ ہے، کینیڈا ہے، یورپی یونین ہے، یہ ان کا حال ہے جو اپنے آپ کو مہذب قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ باعث اطمینان ہے کہ ان کی مخالفت کے باوجود یہ قرارداد پاس ہوئی۔

جہاں تک تحقیقات کا تعلق ہے، میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ محض اشک شوئی کے لیے کوئی تحقیقات ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہیں۔ اس کے لیے بین الاقوامی سطح پر مظاہرے ہونے چاہییں۔ یقینی بنانا چاہیے کہ تحقیقات کے لیے بے داغ کردار کے لوگوں پر مشتمل ٹریبونل قائم ہو۔ یہ ٹریبونل تحقیقات کرے، انٹرویوز لے اور پھر اس کے بعد رپورٹ

دے اور میں یہ بھی مطالبہ کرتا ہوں کہ اس میں مسلمانوں کی خاطر خواہ نمائندگی ہونی چاہیے۔

جناب والا! تشدد کے لیے جو جواز یہ دے رہے ہیں، مجھے بڑے دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ پاکستان کی حکومت کا دامن بھی اس سے پاک نہیں۔ تشدد جو بین الاقوامی طور پر انسانیت کے خلاف ایک تسلیم شدہ جرم ہے، اگر اقوام متحدہ بھی اس کی اجازت دے اور خاص طور سے مذہبی علامتوں کا استعمال کیا جائے تو اس کے خلاف بھرپور جدوجہد ہونی چاہیے، اسے نمایاں ہونا چاہیے، علمی، سیاسی ہر سطح کے اوپر اور او آئی سی، مسلمان ممالک اور تیسری دنیا کے ممالک کو آگے بڑھ کر اس بات کو اٹھانا چاہیے۔

توہین انبیاء اور الہامی کتب پر کنونشن: اگلا مطالبہ جناب والا! میں یہ کہتا ہوں کہ جس طرح انسانی حقوق کنونشنز کی ضرورت ہے۔ اسی طرح توہین انبیاء اور الہامی کتب کی توہین پر کنونشن کی بھی ضرورت ہے۔ توہین انبیاء کی روک تھام ایک مہذب معاشرے کی ضرورت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح ہتک عزت کا قانون ہے کہ ایک فرد کی عزت سے آپ نہیں کھیل سکتے۔ اسی طرح اللہ، اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء کرام اور مقدس کتابوں کی تقدیس ہے، وہ چیزیں جن پر لوگ اپنا ایمان رکھتے ہیں اور جن پر اپنی جان دینے کے لیے تیار ہیں، ان کی عزت ہماری عزت سے زیادہ ہے۔ چنانچہ توہین انبیاء والہامی کتب پر بین الاقوامی کنونشن ہونا چاہیے۔ موجودہ واقعات نے واضح کر دیا ہے کہ امریکہ قصوروار ہے توہین انبیاء کا، مسلمانوں کے خلاف، اسلام کے خلاف اور اسلام کی فورسز کے خلاف۔ تو اس کے لیے بین الاقوامی کنونشن بننا چاہیے۔

خارجہ پالیسی پر نظر ثانی: ان سب باتوں کی روشنی میں آخر میں، میں یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اب وہ وقت نہیں آگیا کہ پاکستان اور مسلمان ممالک اپنی اپنی خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کریں۔ ہم تابع مہمل بن کر چل رہے ہیں۔ محض اشک شوئی اور خانہ پری کے لیے بیان دے دے دیتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جو اشارے وہاں سے آرہے ہیں، وہ ہمارے لیے

احکامات کا درجہ رکھتے ہیں۔ بڑی حیرانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ ہم پر تو کوئی پریشر نہیں ہے لیکن اقدامات اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں سوال کرتا ہوں کہ اگر آپ پر پریشر نہیں تو کون سا دباؤ ہے کہ آپ دن اور رات بے چین ہیں کہ اسرائیل کو تسلیم کریں۔

میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اپنی خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ ہم سب سے دوستی چاہتے ہیں لیکن عزت کے ساتھ۔ اپنے ایمان، اپنی سلامتی، اپنے مفادات اور ملت اسلامیہ کے وسیع تر مفاد کے ساتھ، یہ وہ ڈھانچہ ہے جس میں ہماری خارجہ پالیسی کو بننا چاہیے۔ ہمارے ملک میں بھی اور دیگر ملکوں میں بھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان اس معاملے میں قدم اٹھائے۔ اور میں چاہوں گا کہ سینیٹ اور قومی اسمبلی خارجہ پالیسی کو زیر بحث لا کر خارجہ پالیسی کی تشکیل نو کریں تا کہ ہم ایک باوقار اور باعزت طریقے سے اور آزادی سے اپنی پالیسیاں تیار کر سکیں۔

(یکم جون ۲۰۰۵ء)

پاکستان کا ایٹمی پروگرام، امریکی دباؤ اور اثرات

دہشت گردی کے خلاف امریکی قیادت میں جنگ کا حصہ بننے کے بعد سے امریکہ کی جانب سے پاکستان پر جن مختلف عنوانات کے تحت دباؤ ڈالا جاتا رہا ان میں پاکستان کی ایٹمی صلاحیت ایک واضح ہدف کے طور پر سامنے آئی۔ دباؤ کی بنیاد بنانے کے لیے پاکستان پر ایٹمی ٹیکنالوجی کی دوسرے ملکوں کو منتقلی کے الزامات لگائے گئے اور اسی تسلسل میں محب وطن اور نامور پاکستانی سائنس دانوں سے تحقیقات کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ دباؤ کا ہی نتیجہ تھا کہ ایٹمی پروگرام کے بانی ڈاکٹر اے کیو خان کو ۲۰۰۱ء میں ایٹمی پروگرام سے متعلق ادارے (KRL) کی سربراہی سے سبکدوش کر کے صدر پاکستان (جنرل پرویز مشرف) کا مشیر مقرر کیا گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد ۳۱ جنوری ۲۰۰۴ء کو انہیں مشیر کے منصب سے فارغ کر دیا گیا۔ اور بعد ازاں نظر بند کر دیا گیا۔ حتّٰی کہ ایک موقع پر ان کی امریکہ حوالگی کے بارے میں بھی بات کی جانے لگی۔

پروفیسر خورشید احمد نے سب سے پہلے ۱۹ جنوری ۲۰۰۴ء کو سینیٹ میں یہ مسئلہ اٹھایا۔ بعد ازاں سات مختلف مواقع پر ایٹمی پروگرام، اس میں پاکستانی سائنس دانوں کے کردار کے بارے میں ہونے والی تحقیقات اور اسی ضمن میں ان کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی پر گفتگو کی۔ اس بحث میں پروفیسر خورشید نے ایٹمی صلاحیت کے حوالہ سے دنیا بھر میں ہونے والی پیش رفت اور اسی ضمن میں تخفیف اسلحہ کی بین الاقوامی کوششوں کا جائزہ لیتے ہوئے امریکہ کے دہرے معیارات کو بھی واضح کیا ہے۔ آنے والی سطور میں پروفیسر خورشید احمد کی ۸ مختلف مواقع پر کی جانے والی یہ تمام تقاریر مرتب کر کے تین مضامین میں پیش کی گئی ہیں۔

جناب چیئرمین! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اس موضوع پر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔

مسئلہ کی حساسیت: میں بابر صاحب کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ بہت سے حساس معاملات بھی اس موضوع کا حصہ ہیں۔ ان شاءاللہ میری بھی کوشش یہ ہوگی کہ ان میں سے کوئی چیز اس طرح زیر بحث نہ آئے جس سے قومی مفادات کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہو۔ البتہ میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اس معاملے پر بحث صرف پارلیمنٹ میں ہی نہیں بلکہ تمام اہم سیاسی پارٹیوں کو اعتماد میں لے کر ہونی چاہیے۔ دوسری جانب مسئلہ کی حساسیت کے پیش نظر حکومت کو بند دروازے کی مشاورت بھی کرنا چاہیے۔ تاہم جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ قومی نہیں بین الاقوامی مسئلہ ہے اس لیے ہم نے بہرحال اس پر کھل کر بات کرنی ہے۔

جناب والا! وقت کی قلت کی بناء پر اشارات میں ہی سہی، لیکن اس مسئلے کے جو مختلف پہلو ہیں وہ ضرور اس ایوان کے اور پوری قوم کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔ مجھے رضا ربانی صاحب کے سوالات[1] سے اتفاق ہے۔ انہوں نے بڑی محنت کر کے صحیح سوالات مرتب کیے ہیں اور حکومت کو ان کا جواب دینا چاہیے۔ میں ان کو از سر نو نہیں چھیڑوں گا۔ جس تردید اور بدانتظامی کا انہوں نے ذکر کیا ہے اور اس معاملہ میں پارلیمنٹ کو جس طرح نظر انداز کیا گیا ہے، میری نگاہ میں بھی وہ سب چیزیں قابل گرفت ہیں اور ان پر ہم اپنے احتجاج کو ریکارڈ کرانا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ مجھے خوشی ہے کہ آج کم از کم آپ نے اور قائد ایوان نے تعاون کیا کہ قواعد معطل کر کے ہم اس موضوع پر بات کر سکیں۔

کیا سب کچھ اچانک ہوا ہے: جناب والا! پہلی بات تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ معاملہ محض چار فروری (۲۰۰۴ء) کو ڈاکٹر اے کیو خان کے ٹیلی وژن پر 'اعترافی بیان' کے عمل تک محدود

---

[1] جناب سینیٹر رضا ربانی کے ۱۹ مختلف سوالات میں جنرل پرویز مشرف اور ان ہی کی وزارت خارجہ کے مختلف بیانات میں تضادات کی طرف اشارہ شامل تھا۔ اس کے ساتھ ہی ماضی کے مختلف ادوار میں کے آر ایل کے نظام اور نگرانی کے بارے میں تفصیلات مانگی گئی تھیں۔ نیز عالمی اداروں، امریکہ اور یورپی ملکوں کی جانب سے آنے والے سوالات اور دباؤ کے بارے میں دریافت کیا گیا تھا۔

نہیں ہے۔ آپ یہ دیکھیے کہ کس طرح ۲۰۰۱ء میں ڈاکٹر اے کیو خان کو ان کے منصب سے فارغ کر کے صرف مشیر کی نمائشی حیثیت دی گئی۔ یہ پہلا اشارہ تھا کہ ہوا کا رخ کیا ہے۔ درحقیقت ۹/۱۱ کا معاملہ صرف یہی نہیں ہے کہ ہم نے اپنے ایئرپورٹ، زمینیں اور فضائیں امریکہ کے لیے کھول دی ہیں بلکہ ہم نے امریکہ کو موقع دیا ہے کہ ہماری ایٹمی صلاحیت کے بارے میں جو کچھ ہم سے کہلوانا چاہتا ہے یا جہاں لے جانا چاہتا ہے اس کے لیے ہم پر دباؤ ڈال سکے۔

جناب والا! آپ کو یاد ہو گا کہ یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا۔ اس سے قبل ڈی بریفنگ کا معاملہ شروع کیا گیا تھا۔ ڈی بریفنگ، جہاں تک مجھے معلوم ہے صرف جاسوسوں کی ہوتی ہے لیکن ہم نے اس اصطلاح کو اپنے ان محسنوں کے لیے استعمال کیا ہے جو اس ملک کی سلامتی اور خود مختاری اور اس کے دفاع کو ہر قیمت پر قربانی دے کر مؤثر بنانے کے لیے مصروف کار رہے ہیں۔ پھر ڈی بریفنگ کے اس نام نہاد عمل کو بھی ہم نے بالاقساط کیا۔ پہلے دو سائنس دانوں کو اٹھایا اور کہا کہ اے کیو خان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی ایوان میں کہا گیا کہ کوئی ان کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ پھر یکے بعد دیگرے دوسروں کو لیا جاتا رہا اور بالآخر جس شخص نے اس ملک پر سب سے بڑا احسان کیا اور جس نے اس کے لیے بڑی قربانیاں دیں، اس کو بھی نشانہ بنایا گیا۔

دوسری جانب ہمارے یہ سارے اقدامات نہایت ہی اہانت اور ذلت آمیز طریقے سے کیے گئے۔ ہمیں اس پورے تسلسل کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ قسط وار ہونے والے یہ اقدامات ایک بڑے کھیل کا حصہ ہیں۔ ابھی یہ ڈرامے کے محض چند ایکٹ ہوئے ہیں اور میں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی کئی ایکٹ مزید ہونے والے ہیں۔ اس تناظر میں جناب والا! یہ مسئلہ اپوزیشن یا محض حکومت کا بھی نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حکومت، فوج، پارلیمنٹ ہم سب کا مشترک معاملہ ہے۔ اس ملک کا تحفظ اور اس کی ایٹمی دفاعی صلاحیت کا تحفظ ہی نہیں اس صلاحیت کی ترقی بھی ہمارا مشترکہ ایجنڈا ہے۔ اس لیے کہ

دفاعی صلاحیت ایک منجمد نہیں بلکہ متحرک تصور ہے۔ اس پر حالات کی مناسبت سے نظر ثانی کرنا پڑتی ہے۔ وقتاً فوقتاً جائزہ لیتے ہوئے اس کے لیے تحقیق وترقی کا انتظام ناگزیر اور ضروری ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے سائنسدانوں کا تعاون اور ضروری وسائل کی فراہمی اور وہ تمام طریقے اختیار کرنا ضروری ہیں جو دنیا کی پابندیوں کے باوجود ہم نے اپنی آزادی، خود مختاری اور سلامتی کے تحفظ کے لیے ماضی میں بھی کیے ہیں اور آئندہ بھی کرنے پڑیں گے۔ اس لیے جناب والا! یہ مسئلہ کوئی سادہ مسئلہ نہیں بلکہ بہت بڑا اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک کھیل ہے جس سے پاکستان کو کارنر کیا جارہا ہے، اس پر میڈیا نے کردار ادا کیا ہے، اس پر ہمارے دشمن بھی ایک کردار ادا کر رہے ہیں اور اس کھیل میں ہمارے وہ 'دوست' بھی شریک ہیں جن کا آپ کو بہت سہارا ہے۔

کیا کرپشن کوئی مسئلہ ہے؟: دوسری بات جناب والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خواہ امریکہ کی جانب سے کچھ بھی کہا جائے، اصل مسئلہ کسی خاص ادارے میں کرپشن کا نہیں ہے؟ کرپشن ایک الگ چیز ہے اور ٹھیک ہے کہ اس کے ذمہ دار جو بھی ہوں، خواہ اے کیو خان ہوں، آپ ہوں، میں ہوں یا جنرل مشرف ہوں، قانون اور ضابطہ سب کے لیے یکساں ہونا چاہیے۔ لیکن وہ ایک بالکل الگ مختلف مسئلہ ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ یہ کرپشن کا مسئلہ تھا تو میری نگاہ میں اس جیسا کم عقل کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ کے خیال میں امریکہ پاکستان سے کرپشن ختم کرنا چاہتا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ امریکہ نے ایک وزیر اعظم کو سو ملین ڈالر کا ذاتی تحفہ دینے کا وعدہ کیا کہ تم ٹیسٹ نہ کرو۔ کیا یہ کرپشن نہیں ہے؟ اور کیا خود امریکہ میں اور باقی دنیا میں کرپشن نہیں ہے؟ کرپشن جہاں بھی ہو اسے ختم ہونا چاہیے لیکن یہاں مسئلہ کرپشن کا نہیں ہے۔

جہاں تک مالی فوائد کا تعلق ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی بڑی زیادتی اور بڑا ظلم ہے۔ کسی سائنس دان کے پاس اگر یہاں چار مکان ہیں، تو کیا اسی طرح یہاں کتنے ہی سیاستدانوں، جرنیلوں اور دیگر لوگوں کے پاس اس سے بھی زیادہ مکان موجود نہیں ہیں؟ اور کیا آپ اس

بنیاد پر کسی بھی دوسرے شخص کے ساتھ اس طریقے سے سلوک کریں گے جو آپ ان محترم سائنس دانوں کے ساتھ کر رہے ہیں؟

جو شخص باہر کی ایک بڑی تنخواہ چھوڑ کر اور اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر، آپ کے اور اپنے ملک کو بچانے کے لیے آیا وہ بلاشبہ ایک ٹیم کا حصہ ہے۔ لیکن اس ٹیم میں جو جوہری قائد تھا وہ ڈاکٹر اے کیو خان ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ آپ ایک طرف اس کے منہ پر طمانچہ مارتے ہیں اور کہتے ہیں یہ میرا ''ہیرو'' بھی ہے۔ یہ کوئی طریقہ ہے؟ درحقیقت یہ مسئلہ کسی بھی طرح کرپشن کا نہیں ہے۔

کیا ایٹمی افزودگی مسئلہ ہے: میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرح یہ مسئلہ کرپشن کا نہیں ہے اسی طرح افزودگی کا بھی نہیں ہے۔ جوہری صلاحیت ہی آج تک دنیا میں امن کی ضامن رہی ہے۔ سب سے پہلے جرمنی نے اس ٹیکنالوجی کو ترقی دی۔ امریکہ نے چوری چھپے دباؤ ڈال کر اور پیسہ خرچ کر کے جرمن سائنس دانوں کے ذریعے اس ٹیکنالوجی کو حاصل کیا۔ جب ایک سپر پاور کے ہاتھ یہ نیوکلیئر استعداد آئی تو جواباً اس کے مدمقابل طاقت روس نے ایٹمی صلاحیت کے ذریعے دفاعی صلاحیت حاصل کی۔ اس کے بعد کسی اور کو یہ ضرورت نہیں تھی۔ لیکن فرانس اور برطانیہ دونوں نے ایٹمی صلاحیت کا راستہ اختیار کیا۔ پھر چین کو بھی یہ راستہ اختیار کرنا پڑا۔ ہمارے لیے ان میں سے کسی کا بھی مقابلہ کرنا ضروری نہیں تھا۔ لیکن جب بھارت نے یہ راستہ اختیار کیا تو ہمارے لیے لازمی تھا کہ ہم بھی اپنی سلامتی کے تحفظ اور جنگ کے خطرات سے بچنے کے لیے یہ صلاحیت حاصل کریں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر دنیا دوسری جنگ عظیم کے بعد تیسری جنگ سے محفوظ رہی ہے تو اس کی وجہ ایک ہے اور وہ ہے امکانی جنگ میں مدمقابل دو قوتوں کے پاس موجود ایٹمی صلاحیت۔

اس ضمن میں این پی ٹی کا عالمی معاہدہ دراصل ایک سازش ہے کہ جن پانچ ممالک کو اس وقت ان کی نگاہ میں نیوکلیئر استعداد حاصل تھی، وہ اس ٹیکنالوجی پر اجارہ داری بنالیں اور کوئی ان کا مقابل نہ ہو۔ ان کے دہرے معیارات یہ ہیں کہ انہوں نے اس زمانے میں بھی

بھارت کو سپورٹ کیا۔ اس بات کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں کہ ایٹمی ٹیکنالوجی امریکہ اور فرانس سے بھارت کو منتقل ہوئی۔ اس طرح اسرائیل کو نوازا گیا۔ کھلے اور خفیہ طور پر چوریاں کروا کر بھی، اس کام کا سارا ریکارڈ موجود ہے۔ اس تناظر میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کوئی ایٹمی صلاحیت کا مسئلہ نہیں تھا اور آج بھی نہیں ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ ایٹمی صلاحیت کو محدود رکھنے کے نام پر پہلے سی ٹی بی ٹی کو لایا گیا اور پھر اس سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کے بعد امریکہ نے توثیق نہیں کی، کیوں نہیں کی؟ اس لیے کہ وہ جوہری صلاحیت بڑھا رہا ہے۔ وہ اس کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ اس نے یہاں تک کہا ہے کہ ہم تجربے بھی کریں گے، اور پھر برابر تجربات کر رہے ہیں۔ اس نے چھوٹے ایٹمی ہتھیار بھی بنائے ہیں۔ لیکن اگر ایٹمی صلاحیت کا مسئلہ نہیں ہے تو پھر مسئلہ کیا ہے؟ مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان یا کسی مسلمان ملک کے پاس یا کسی ایسے ملک کے پاس جو کل اپنے تحفظ کے لیے ایک بین الاقوامی کردار ادا کر سکے،، یہ ایٹمی صلاحیت نہ ہو۔ چنانچہ مسئلہ ڈاکٹر اے کیو خان کی ذات نہیں ہے، مسئلہ آپ کی استعداد ہے۔ اور اگر آپ مسئلہ کو کنفیوز کر رہے ہیں تو آپ اپنے آپ کو اور پوری قوم کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

پوری تصویر کیا بن رہی ہے؟

سوال یہ ہے کہ اگر ایٹمی افزودگی مسئلہ نہیں ہے تو پھر مسئلہ ہے کیا؟ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں پوری تصویر کو سامنے رکھنا ہو گا۔

بیرونی دباؤ کے سامنے دستبرداری: اس ضمن میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اس وقت پاکستان کی آزادی اور سلامتی کے تحفظ کے بارے میں موجودہ قیادت ناکام رہی ہے۔ آپ برابر بیرونی دباؤ کو قبول کر رہے ہیں اور اس کے باوجود قبول کر رہے ہیں کہ ۹/۱۱ سے ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ خود ۹/۱۱ آج تک ایک معمہ ہے اور امریکہ اس کے سارے حقائق کو دنیا کے سامنے پیش کرنے یا دنیا کے سامنے لانے سے کترا رہا ہے، آزاد کمیشن قائم نہیں کرنے

دیا جارہا ہے، پارلیمانی کمیشن کو کام نہیں کرنے دیا جارہا، جاسوسی ایجنسیاں کیا کر رہی ہیں اور کس طرح جھوٹ کی بنیاد پر دنیا کو دہشت زدہ کیا جارہا ہے، یہ سب حقائق دنیا کے سامنے آچکے ہیں اور آرہے ہیں۔ ہم اپنی کمزوریوں کی بناء پر دراصل اسی کا ایک اکھاڑہ بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے ایک جو ہمالیائی غلطی کی ہے کہ آنکھیں بند کر کے ۹/۱۱ کے بعد امریکی مطالبات کے جواب میں ہاں کہتے رہے ہیں، اب اس کی سزا بھگت رہے ہیں اور مسلسل دلدل میں دھنستے چلے جارہے ہیں، تو پہلا مسئلہ یہ ہے۔

یہ تشویشناک پہلو بھی سامنے رکھیے جناب والا کہ یہ مسئلہ اب امریکہ کے انتخاب کا ایک مقامی مسئلہ بن رہا ہے۔ جو خطاب ابھی بش نے کیا اس میں اے کیو خان کے بارے میں ۴۵ سطریں ارشاد فرمائیں۔ کیونکہ اسے افغانستان اور عراق میں اپنی جنگی مہمات کا جواز پیش کرنے کے لیے کوئی ہدف چاہیے۔ جنگوں میں اسے مار پڑ رہی ہے اور وہاں کے بارے میں اس کا جھوٹ کھل کر سامنے آگیا ہے۔ حتّٰی کہ اس وقت یہ بات کھل کر ہو رہی ہے کہ عراق پر فوج کشی جن وجوہ کی بناء پر کی گئی تھی وہ سب غلط تھیں۔ امریکی سینیٹ نے خود ہی یہ کہا ہے کہ ہم نے یہ بات نہیں کہی تھی۔ اس تناظر میں اب اگر اے کیو خان مسئلہ بن رہا ہے تو یہ بے سبب نہیں ہے۔

غیر مہذب طریق کار: جناب والا! دوسرا مسئلہ طریق کار سے متعلق ہے۔ اگر اس پورے معاملے میں کوئی حقیقت تھی اور یہ کوئی مسئلہ تھا تو اس سے نمٹنے کا ایک مہذب، قانونی اور اخلاقی طریقہ ہوتا ہے۔ آپ غنڈوں کی طرح آئیں اور ایک باعزت آدمی کو گھر سے اٹھا کر لے جائیں، دو دو دن تک خاندان کو پتا نہیں کہ کوئی کہاں گیا ہے حالانکہ یہ معزز اور مخلص افراد ہیں، یہ کوئی مجرم نہیں ہیں۔ اس طرح اس پورے کے پورے معاملے کو خراب کیا گیا ہے۔ اگر فرض کیجیے کچھ سوالات International Atomic Energy Agency نے آپ کو بتائے تھے تو اس کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ آپ لوگوں کو گرفتار کریں اور ڈی بریف کریں۔ آپ اپنے ذمہ دار حکام کو جنہوں نے قربانیاں بھی دی ہیں اور خدمات بھی کی ہیں، بلا کر بیٹھیے، سب کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر اے کیو خان کو بھی اعتماد میں لیجیے جو اس پورے پراجیکٹ

کا لیڈر رہا ہے۔ اس کے بعد باہم مشاورت سے ایک موقف اپنایئے۔ یہ طریقہ نہیں ہے کہ آپ ایک ایک کو اٹھا کر لے جائیں اور ڈی بریفنگ کے نام پر ان کے ساتھ توہین آمیز سلوک کریں۔ یہ ڈی بریفنگ کا نام ہم نے آج ہی سیکھا ہے، یہ کام تو ہم کب سے کر رہے ہیں۔ ہم نے اپنی پوری جوہری صلاحیت کی ترقی، پوری دنیا کی ناروا پابندیوں سے انحراف کر کے کی ہے اور ہمیں اس پر فخر ہے۔ اس طرح اگر آپ اپنے سائنسدانوں کو قربانی کا بکرا بنائیں گے اور ان کی بے عزتی کریں گے تو یہ قوم کی بے عزتی ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر کل کوئی سائنسدان اس طرح کے قومی خدمت کے کام کو انجام دینے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔ ان لوگوں کا دفاع ضروری ہے، اس کو کسی بھی طرح ہلکا نہیں لینا چاہیے۔ فی الحقیقت جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے یہ بالکل غلط، غیر انسانی، غیر قانونی اور حکمت عملی کے اعتبار سے غلط ہے۔

ایٹمی دفاعی صلاحیت کے حجم میں تخفیف: جناب والا! میں تیسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں اور میں بڑے دکھ کے ساتھ یہ کہہ رہا ہوں کہ جو کچھ جنرل پرویز مشرف صاحب نے کہا ہے اور کیا ہے اس کے نتیجے کے طور پر آپ کی ایٹمی دفاعی صلاحیت کے حجم میں تخفیف کے لیے کم از کم ۵۰ فیصد تک سہی، امریکہ اپنے مقاصد حاصل کر چکا ہے۔ کیا اس سے ان سائنسدانوں کا مورال نہیں گرا؟ جنہوں نے قربانیاں دی ہیں، آپ نے آئندہ آنے والے محب وطن ماہرین کے سامنے کیا مثال قائم کی ہے۔ مجھے معلوم ہے اس وقت کس اذیت کی کیفیت سے یہ لوگ گزر رہے ہیں۔ میرے پاس لوگ آتے ہیں اور مجھے وہ کچھ بتاتے ہیں جو آپ سے نہیں کہہ سکتے، جو آپ کے اندر کے تضادات ہیں اس نے ان تمام لوگوں کو کہاں پہنچایا ہے۔

پھر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ذرا اس ماحول کو یاد کیجیے جس میں ہم نے اپنی استعداد حاصل کی ہے۔ پابندیاں اس طرح لگی ہوئی تھیں کہ ہم ایک نٹ بولٹ بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ پھر یہ کوئی راز نہیں۔ جواب سامنے آیا ہے کہ ہم نے سب کچھ کس طرح حاصل کیا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے خفیہ سرگرمی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ آج آپ اس کی مذمت کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی حکمت عملی نے ہم کو بچایا ہے۔ آج آپ نے

اس نام نہاد بلیک مارکیٹ کے نام پر جو اقدام کیا ہے، اس سے وہ راستے بند ہو گئے ہیں اور یوں ہمارے لیے اپنی استعداد کو بر قرار رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ افراد کار کے اعتبار سے بھی، ٹیکنالوجی کے اعتبار سے بھی جو اسے ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ ہر اعتبار سے مشکلات اس طرح بڑھ گئی ہیں کہ آج ان معاملات پر اطمینان کا اظہار ممکن نہیں ہے۔

ٹیکنالوجی کسی بھی میدان میں ہو اس میں پیش رفت ہوتی رہتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ماضی میں جو کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے کر لیا اب ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو ایک جاری عمل ہے، آپ نے جب اس عمل کو الٹ دیا ہے تو آپ کی صلاحیت اس میں کس طرح باقی رہ سکتی ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ تحقیق و ترقی کے عمل کو متاثر کر کے ہم نے اپنی ایٹمی دفاعی صلاحیت کو متاثر کر دیا ہے۔ اگر اب بھی ہم نے اس کو نہ سنبھالا اور پالیسی نہ بدلی تو مجھے ڈر ہے کہ امریکہ کا جو اصل مقصد ہے کہ ایٹمی صلاحیت کو لپیٹ دینا ہم اس کی طرف جا رہے ہیں۔ اسے ہم نے ہر صورت میں روکنا ہے۔

قومی اور ملکی ساکھ کو دھچکا: جناب والا! میں چوتھی بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس پورے اقدام سے جو امریکہ نے کروایا ہے اور جس میں ہم شریک ہوئے ہیں پاکستان کی ساکھ کو شدید دھچکا لگا ہے۔ پاکستان کو ایک غیر ذمہ دار ریاست، ایک ایسی ریاست کہ جس کی قیادت منقسم ہے، جس میں ایٹمی صلاحیت کے نظام کے بارے میں ابہام ہے۔ جہاں کچھ پتا نہیں ہے کہ کمانڈ کا ڈھانچہ کیا تھا اور کیا ہے۔ حالانکہ ہمارا ایٹمی پروگرام پرویز مشرف نے نہیں بنایا ہے، یہ اس سے بہت پہلے بنا ہے اور کمانڈ کنٹرول نظام روز اول سے قائم ہے۔ لیکن آپ نے یہ تاثر دیا ہے کہ کوئی بھی شخص اپنی ذاتی مرضی سے جو چاہے اور جس طرح چاہے ہمارے یہاں کر سکتا ہے۔ یعنی آپ نے خود اپنے اعترافات سے پاکستان کے ایک غیر ذمہ دار ریاست ہونے کا پیغام دیا ہے جو پاکستان پر ضرب کاری ہے۔ آپ کو شرم آنی چاہیے کہ کس طرح دشمن جو بات کہتا تھا، دشمن کی بات کو آپ آج اپنے منہ سے کہہ رہے ہیں۔

مسلم دنیا سے تعلقات میں خرابی: جناب والا! پانچویں چیز جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ

آپ کے اس طرز عمل سے پاکستان اور مسلم ممالک کے تعلقات خراب ہوئے ہیں۔ ایران اور لیبیا کے نام تو نمایاں طور پر سامنے آرہے ہیں لیکن اور بھی کئی ملک ہیں جنہوں نے کسی بھی شکل میں کوئی تعاون کیا۔ دنیا جانتی ہے کہ ملکوں کے درمیان تعلقات اور تعاون کے حوالہ سے اعلانیہ اور خفیہ دونوں چیزیں ہمیشہ ساتھ ہوتی ہیں، لیکن اب اس نئی صورت حال کے نتیجے کے طور پر ہمارا اعتماد کا جو تعلق اور تعاون تھا، وہ متاثر ہوا ہے۔ اور پھر مسلم ممالک ہی نہیں بلکہ چین، چین سے ہماری دوستی ایک تزویراتی دوستی ہے اور تعاون ایک تزویراتی تعاون ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ تازہ ترین جو چیزیں آرہی ہیں ان کے مطابق پہلے ایران اور لیبیا کو اس معاملہ میں ملوث کیا گیا، پھر شمالی کوریا اور اب چین کا نام بھی آگیا ہے۔ تو یہ سارے کا سارا معاملہ ہمارے تمام تعلقات کو ختم کرنے اور ہمیں تنہا کر دینے کی کوششوں کا بھی حصہ ہے۔

فوجی قیادت اور عوام میں فاصلہ: جناب والا! چھٹی چیز جو اس سے نکل رہی ہے وہ یہ ہے کہ فوجی قیادت اور عوام کے درمیان بے اعتمادی بڑھ رہی ہے۔ اے کیو خان اور اس کے ساتھی سائنسدان قوم کے ہیرو اور محسن ہیں۔ آج تک وژن یہ تھا کہ سائنسدان، اے کیو خان اور فوجی قیادت ساتھ ہیں اور سب احترام کی نظر سے دیکھے جارہے تھے لیکن آج آپ نے ان دونوں کے درمیاں ایک تصادم پیدا کر کے پوری قوم کے سامنے اس کو بانٹ دیا ہے اور جوں جوں آپ آگے بڑھ رہے ہیں اسی صورت حال کو مزید تباہی کے راستے پر لے کر جارہے ہیں۔

کیا کیا جائے؟

اب جناب والا! اس سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟ بلاشبہ یہ ایک قومی مسئلہ ہے اور پوری قوم ایک صدمے میں مبتلا ہے لیکن اب ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ میری نگاہ میں اس کا راستہ یہی ہے کہ ہم اپنے نظام اور خاص طور پر فیصلہ سازی کو درست کریں۔

اداروں کو مستحکم کیجیے: ہمیں سمجھنا چاہیے کہ اس ملک کے سارے مسائل کی بنیادی وجہ ایک

فرد کا فیصلہ کن اختیار ہے۔ جب تک ادارے فیصلے نہیں کریں گے، مشاورت کے نظام کو قائم نہیں کیا جائے گا اور سب کو ساتھ ملا کر قومی معاملات کو طے نہیں کیا جائے گا، یہی ہو گا۔ خدا کے لیے آنکھیں کھولیے۔ نائن الیون کے بعد امریکہ کی ایک کال پر ان کے مطالبات مان کر آپ نے یہ سلسلہ شروع کیا۔ اس کے بعد آپ برابر یہی کر رہے ہیں اور اس پورے بحران کو لانے کی یہ انتہا ہے۔ چنانچہ پہلی چیز اداروں کو مستحکم کرنا اور اداروں کو آزاد کرانا ہے۔

قومی اتفاق رائے: دوسری چیز یہ ہے کہ اس وقت حکومت اور اپوزیشن کے درمیان قومی اتفاق رائے کی ضرورت ہے۔ اس میں وہ اپوزیشن بھی شامل ہے جو ملک سے باہر ہے، یہ وقت ہے کہ سوچ سمجھ کر مشاورت کے ساتھ اقدامات کیے جائیں۔ ہم سب مل کر کے بیٹھیں۔ فرحت اللہ بابر صاحب نے کہا کہ ان کے پاس بہت سی ایسی معلومات ہیں جن پر یہاں پر بات نہیں کر سکتے۔ میرے پاس بھی ایسی معلومات ہیں لیکن اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم سب مل کر کے بیٹھیں اور اس طرح کے معاملات میں قومی اتفاق رائے کو پیدا کریں۔ یہی قومی اتفاق رائے آپ کا اصل دفاع ہے۔ آپ کا دفاع یہ نہیں کہ آپ بش کی ہاں میں ہاں ملائے چلے جائیں۔ اپنی قوم کے اوپر اعتماد کیجیے۔ اس کے اندر جذبہ پیدا کیجیے۔ یہ آپ کا بہترین دفاع ہو گا۔

خارجہ پالیسی پر نظر ثانی: تیسری چیز جناب والا یہ ہے کہ وقت آ گیا ہے کہ ہم خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کریں۔ ہم اپنے لیے نئے راستے پیدا کریں۔ امریکہ کو یہ پیغام اب چلے جانا چاہیے کہ بس بہت ہو چکا! جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ یہ قوم اپنے نظریے، اپنی اقدار اور اپنی آزادی کے تحفظ کا خود دفاع کرے گی۔ آپ کی چاکری اور آپ کی حاشیہ برداری نہیں کرے گی۔ ہم نہیں کہتے کہ آپ کسی سے لڑیئے لیکن ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ اپنے تحفظ کے لیے خارجہ پالیسی کو آزاد اور نئے راستے دینا بڑا ضروری ہے۔ جناب والا! یہ معلوم ہونا چاہیے کہ امریکہ کی بالادستی اور دخل اندازی کی پالیسی کس نے قبول کی اور کون اسے مسلسل آگے بڑھا رہا ہے۔

ایٹمی پروگرام کے ضمن میں نیویارک ٹائمز نے جو رپورٹ ابھی دی ہے اس کے اندر

صاف طور پر یہ چیز موجود ہے۔ اسی طرح بش نے نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی میں جو تقریر کی ہے اسے غور سے پڑھیے۔ اس میں اس نے کہا ہے کہ صرف عبدالقدیر خان اور ان سے متعلق اطلاعات ہی نہیں، ہم ان سے متعلق لیبارٹریز کی بھی تلاشی لیں گے اور ان کو بند کریں گے۔ یہ الفاظ بش نے استعمال کیے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ ہم ان ممالک کی صلاحیت ختم کر دیں گے اور ہم ان پر قبل از وقت چیکنگ کریں گے کہ وہ ایسا کریں یا نہ کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان شاءاللہ ہم ان کو ایسا نہ کرنے دیں گے لیکن یہ ان کے عزائم ہیں۔ ہمیں اس سے سبق لیتے ہوئے اپنے دفاع کی تیاری کرنی چاہیے۔ امریکہ کی پالیسی بالادستی اور دباؤ والی پالیسی ہے۔ تاہم ہم نے N.P.T جیسے کسی بھی معاہدے پر دستخط نہیں کیے ہیں اس لیے ہماری کوئی قانونی ذمہ داری نہیں ہے۔

خوف نہیں مزاحمت: جناب والا! آخری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی پالیسی جو خوف کی بنیاد پر ہو کامیاب نہیں ہو سکتی کہ آپ امریکہ سے خائف رہیں کہ وہ یہ کر دے گا اور وہ کر دے گا۔ زمینی حقائق بتا رہے ہیں کہ اس کی قوت لامحدود نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ اس نے کہا تھا کہ ہم سبق سکھا دیں گے لیکن ذرا دیکھیے کہ افغانستان میں آنے کے بعد آج امریکہ کس قدر مشکل میں گرفتار ہے اور عراق میں مزاحمت کس طرح بڑھ رہی ہے۔ زمینی حقائق پر نظر رکھنے والوں سے یہ حالات پوشیدہ نہیں ہیں۔ میں آپ سے یقین سے کہتا ہوں کہ امریکہ اس وقت دلدل میں پھنس گیا ہے اور اب کسی ملک پر نائن الیون کے بعد کی طرح کے اقدامات نہیں ہو سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے آپ پر اعتماد ہونا چاہیے۔ اور پاکستان کوئی کمزور (Banana) ریاست نہیں ہے۔ آپ ایمان اور حکمت کا مظاہرہ کیجیے۔ قوم کو ساتھ لیجیے۔ ایک حقیقی مضبوط مؤقف اپنائیے اور مزاحمت کیجیے۔ آج اس ملک کی آزادی اور سلامتی کا تحفظ، اس کی ایٹمی دفاعی صلاحیت کی حفاظت ہمارا اصل مسئلہ ہے اور اس میں امریکہ کسی بھی طرح ہمارا دوست نہیں ہے، جس طرح جوہری استعداد پیدا کرنے میں نہیں تھا۔

سابق امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے بھٹو صاحب کو دھمکایا تھا اور آج بش ہمیں

دھمکا رہا ہے۔ منظر نامہ ایک ہی ہے اور راستہ بھی ایک ہی ہے۔ جس طرح ہم نے کسنجر کی دھمکی کو قبول نہیں کیا تھا اور مزاحمت کی تھی اور الحمدللہ ایٹمی صلاحیت حاصل کی۔ ہم اس کا دفاع بھی اسی طرح سے کر سکتے ہیں اور اگر ہمارے جرنیل دفاع نہیں کر سکتے تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ یہ دفاع ہماری قوم کر سکتی ہے اور قوم کرے گی۔ جو اس کی راہ میں حائل ہو گا وہ خس و خاشاک کی طرح مٹ جائے گا، بہہ جائے گا۔ وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اس میں پوری پارلیمنٹ، پوری قوم اور تمام پارٹیوں کو مل کر یہ کام سر انجام دینا ہے۔ یہ ہے وہ راستہ جس پر ہم چل کر اس دلدل اور اس آزمائش سے نکل سکتے ہیں۔ خدا کے لیے اسے آپ ایک ذاتی مسئلہ نہ بنائیں بلکہ آپ کوشش کریں کہ قومی اتفاق رائے پیدا کیا جائے۔ امریکہ کے عزائم کو ہم سمجھیں، اپنے دفاع کا انتظام کریں۔ پاکستان کو بچانے اور قائد اعظم کے وژن کے مطابق اسے آگے لے کر چلنے کا یہی راستہ ہے۔

ایٹمی دفاعی صلاحیت اس ملک کے لیے اور اس کی بقاء اور سلامتی کے لیے سب سے اہم ذریعہ ہے۔ اس پر اگر کوئی آنچ آتی ہے تو یہ پوری قوم اس کے لیے بغیر وردی کے کھڑی ہو گی اور برداشت نہیں کرے گی، اس میں ہر رنگ و نسل اور عمر کے لوگ شامل ہیں، خواہ وہ سیاسی وابستگی کے اعتبار سے کسی طرف بھی ہوں۔

(۱۹ جنوری ۲۰۰۴ء اور ۱۶ فروری ۲۰۰۴ء)

ڈاکٹر عبد القدیر خان اور پاکستان کی ایٹمی صلاحیت

جناب چیئرمین! جہاں تک اصل معاملے کا تعلق ہے میں آپ کی اجازت سے، آپ کی اور اس ایوان اور حکومت کی توجہ ہفت روزہ Time کی ۷ تا ۱۴ فروری ۲۰۰۵ء کی اشاعت میں شامل اس لیڈ اسٹوری کی طرف دلانا چاہتا ہوں جسے "The Merchant of Menace" کے عنوان کے تحت تقریباً نو صفحات پر پھیلایا گیا ہے۔ اس اسٹوری میں چھ بار اعتراف کیا گیا ہے کہ International Atomic Energy Agency سمیت کسی کے پاس پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں لگائے گئے الزامات کے حوالہ سے کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ چھ بار یہ کہا گیا ہے کہ ثبوت کوئی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود جس انداز میں اس کو لکھا گیا ہے وہ بہت خطرناک ہے۔ اس میں صرف ایک عبد القدیر خان نہیں، وہ تو بے چارہ سبھی کے لیے ہدف بنا ہوا ہے، اس سے آگے بڑھ کر اے کیو خان کے نام اور عنوان کو استعمال کر کے پاکستان کو بلیک میل اور پاکستان کی جوہری صلاحیت کو ہدف بنایا جا رہا ہے۔ یہ چیز ایسی ہے کہ جس کا پاکستان کو نوٹس لینا چاہیے۔ اس معاملے میں ہمارا رویہ معذرت خواہانہ ہے، ہمیں ایک جارحانہ پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ کہنا کہ ساری دنیا میں جوہری افزودگی پاکستان اور اے کیو خان کے ذریعہ ہوئی ہے۔ اس سے بڑا جھوٹ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ جوہری افزودگی پہلے دن سے، اس طرح ہی ہوتی رہی ہے، خود امریکہ نے جرمنی کی استعداد کو جوہری افزودگی کے ذریعے سے حاصل کیا، پھر امریکہ سے اسے روس نے حاصل کیا اور بعد میں امریکہ نے خود برطانیہ کو دیا۔ اس کے بعد بھی سلسلہ رکا نہیں ہے۔

ہمارے یہاں یہ افزودگی آج پیدا نہیں ہوئی ہے اور اب اے کیو خان تو ۲۰۰۱ء سے اپنے عہدے پر بھی نہیں ہیں لیکن جس طرح ان کو نشانہ بنایا گیا ہے اور جس انداز سے بنایا گیا ہے وہ شرمناک ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فرض کیجیے اے کیو خان ملزم ہے لیکن آپ کو سمجھنا ہو گا کہ آج ان کا ہدف اے کیو خان نہیں، پاکستان اور پاکستان کی جوہری صلاحیت اصل ہدف ہے۔ حکومت اپنی آنکھیں کھولے اور اعلان کرے کہ بس اب بہت ہو چکا۔ اس لیے کہ اگر آپ نے کمزوری کا رویہ اختیار کیا تو آپ پر، ایران پر اور میں سمجھتا ہوں کہ پوری مسلم دنیا پر اس [امریکہ] کی آنکھیں ہیں، سعودی عرب کو بھی شامل کر لیا گیا ہے، مصر کی طرف بھی اشارہ ہے تو یہ ایک منظم کوشش ہے۔ خدا کے لیے اس کھیل کو پہچانیے، اس کا مؤثر تدارک کیجیے اور اگر آپ نے یہ نہیں کیا تو یہ سودا پاکستان کو خدانخواستہ، خدانخواستہ، خدانخواستہ بہت مہنگا پڑے گا۔

جناب چیئرمین مجھے ایک جملہ کہنے کی اجازت ہے؟ میں نے اس موضوع پر دفتر خارجہ کے بیان کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے۔ یہ سارا طویل بیان اچھی طرح پڑھنے کے بعد میں دیانتداری سے یہ بات کہتا ہوں کہ ہمارا ردعمل نہایت کمزور ہے۔ دفتر خارجہ کہتا ہے کہ ہماری تحقیقات جاری ہیں اور یہ وہی چیز ہے جو امریکہ چاہتا ہے۔ میری نگاہ میں دفتر خارجہ کا بیان نہایت کمزور ہے ہمیں اپنی حکمت عملی کو تبدیل کرنا ہو گا۔ (۱۰ فروری ۲۰۰۵ء)

تحقیقات میں پاکستانی وزیر کی شمولیت

جناب چیئرمین! میں آپ کے توسط سے اپنے وزیر خارجہ صاحب سے پوچھنا اور قائد ایوان کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ لندن کے اخبار Sunday Times میں ۱۳ فروری ۲۰۰۵ء کے شمارے میں شائع ہونے والی اس بڑی ہی اہم رپورٹ کی وضاحت فرمائیں۔ اس وقت میں اس رپورٹ کے صرف دو پیراگراف آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔

پاکستان نے پہلی بار تسلیم کیا ہے کہ ڈاکٹر اے کیو خان نے ایرانی حکام کو وہ آلات

اور خفیہ معلومات دیں جس کے نتیجے میں تہران ایٹمی ہتھیار بنانے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ ڈاکٹر خان آج کل اسلام آباد میں اپنے گھر میں قید ہیں۔ انہیں ایرانی ایٹمی پروگرام کے پس پشت کارفرما دماغ سمجھا جاتا ہے۔

اس کے بعد کا سارا مضمون پاکستان کے جوہری افزودگی میں ملوث ہونے پر ہے۔ لیکن جناب والا جو چیز میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس رپورٹ میں اقبالی بیان کا جو ذکر ہے، اس کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ یہ پاکستان اور بھارت کے سینئر وزراء اور یورپی یونین کے حکام کے درمیان گزشتہ ماہ کے آخر میں ہونے والی بات چیت میں سامنے آیا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا یہ بات درست ہے؟ اگر یہ درست ہے تو کیا اب جو نام نہاد تفتیش ہو رہی ہے اور پاکستان کو بلیک میل کیا جا رہا ہے، اس میں براہ راست پاکستان کے وزیر اور انڈیا کے وزیر اور یورپین یونین کے آفیشلز مل کر یہ کام سرانجام دے رہے ہیں۔

جناب والا! آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کس قدر تکلیف دہ اور خطرناک رپورٹ ہے، مجھے توقع ہے کہ اس کی تردید ہو گی اور یہ بات کھل کر سامنے آنی چاہیے کہ یہ غلط ہے۔ اگر اس میں خدانخواستہ کوئی صداقت ہے تو پھر حقیقت یہ ہے کہ ملک و قوم سے اس سے زیادہ بے وفائی کوئی نہیں ہو سکتی۔ (۱۵ فروری ۲۰۰۵ء)

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی حوالگی کا مطالبہ

جناب والا! آپ کی اجازت سے میں اس اہم قرارداد کو پیش کر رہا ہوں۔

یہ قرارداد مشترکہ طور پر سینیٹر سعدیہ عباسی، سینیٹر وسیم سجاد، سینیٹر مشاہد حسین سیّد، سینیٹر میاں رضا ربانی، سینیٹر لیاقت بنگلزئی اور میری [پروفیسر خورشید احمد] طرف سے پیش کی جا رہی ہے۔

یہ ایوان امریکی ایوان نمائندگان کے بعض ممبروں کی اس غیر ضروری رائے زنی کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس میں انہوں نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے

بارے میں پوچھ گچھ اور تفتیش کے لیے مطالبہ کیا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو امریکہ کے حوالہ کیا جائے۔

ہم اس اقدام کو پاکستان کی خود مختاری اور سالمیت کی صریح خلاف ورزی اور اپنے معاملات میں مداخلت قرار دیتے ہیں۔ پاکستان کا جوہری پروگرام ہمارے دفاع کے لیے انتہائی ضروری ہے اور کسی کے خلاف نہیں ہے۔ مزید یہ کہ پاکستان ایک ذمہ دار ایٹمی ریاست ہے اور بین الاقوامی سیاست میں اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح آگاہ ہے۔

ہم ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور دیگر سائنس دانوں کی کردار کشی کی واضح الفاظ میں مذمت کرتے ہیں، جس کا مقصد پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو بدنام کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ پاکستانی قوم ایٹمی ٹیکنالوجی، ہتھیاروں کی تیاری اور توانائی کی سیکورٹی کے میدان میں قابل ذکر پیش رفت کے لیے اپنے سائنس دانوں کی مقروض ہے۔ تمام پاکستانی اپنے سائنس دانوں کو احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

جناب چیئرمین! یہ پوری پاکستانی قوم کے جذبات ہیں اور میں اپنے تمام ساتھیوں کا بے حد ممنون ہوں کہ سینیٹ قوم کے ان جذبات کو زبان دے رہی ہے۔ جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہم دنیا کے تمام ممالک سے دوستی اور تعاون کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں لیکن عزت کے ساتھ اور اپنی آزادی اور اپنی ریاست کی خود مختاری کے مکمل تحفظ کے ساتھ۔

امریکہ نے جو یہ رویہ اختیار کیا ہے کہ وہ جس کی چاہتا ہے ٹانگ کھینچتا ہے، جس کی چاہتا ہے بے عزتی کرتا ہے، جس ملک کی چاہتا ہے خود مختاری کی خلاف ورزی کرتا ہے اور پاکستان میں باجوڑ ہو یا ہمارے دوسرے علاقے ہوں ان کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کرتا ہے اور پاکستان پر دباؤ ڈالتا ہے اور اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ عراق اور افغانستان کے بعد

ایران پر بھی فوج کشی کے منصوبے بنائے جارہے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال ہے جس میں اس وقت دنیا کے عوام، جو اصل عالمی اقوام ہیں، ان کی خواہش اور رائے کو نام نہاد بڑی طاقتوں کی جانب سے نظر انداز کیا جارہا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ رائے عامہ کے تازہ ترین سروے میں امریکہ کے ۶۹ فیصد عوام نے موجودہ صدر کی پالیسیوں سے برأت کا اعلان کیا ہے۔ یورپ میں ۷۰ سے ۸۰ فیصدی اور مسلم دنیا میں ۹۰ سے ۹۸ فیصدی اس پالیسی کی مخالفت کر رہے ہیں۔

اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس قرارداد کی صورت میں سینیٹ ایک بہت بڑی ذمہ داری ادا کر رہا ہے۔ یہ اپنے سائنسدانوں کی عزت، حفاظت اور اپنی خود مختاری کی حفاظت اور اعلان ہے کہ ہم ان معاملات کے اندر کسی کو مداخلت کرنے یا اپنے حقوق میں دست اندازی کرنے کا موقع نہیں دیں گے اور پوری دنیا کے مسلمان بلکہ پوری دنیا کے عوام اس استعماری کوشش کی مزاحمت کریں گے۔ سینیٹ کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے، بلکہ میں کہوں گا کہ پورے ملک کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے میں نے اسے پیش کیا ہے۔

(۲جون ۲۰۰۶ء)

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی صحت اور ان پر پابندیاں

جناب چیئرمین! آپ کی اجازت سے آپ کی توجہ ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ کل کے 'پاکستان آبزرور' میں ڈاکٹر اے کیو خان پر فالج کے حملہ کی بڑی اہم اور پریشان کن خبر شائع ہوئی ہے۔ جو تفصیلات ہمارے سامنے آئی ہیں وہ یہ ہیں کہ:

> عظیم ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان متعدد خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہیں اور ان کے گھر سے جہاں وہ گزشتہ سات ماہ سے نظر بند ہیں کسی وقت بھی صدمہ انگیز خبر آسکتی ہے۔

مزید آگے بتایا گیا ہے کہ:

مسٹر ملک نے دعویٰ کیا ہے کہ ایک ذریعہ سے حاصل ہونے والی اطلاع کے مطابق ڈاکٹر خان انتہائی ہائی بلڈ پریشر اور شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہیں اور ان کا ۳۲ پونڈ وزن کم ہوا ہے۔

جناب والا! ڈاکٹر خان ایک قومی اثاثہ اور ہمارے محسن ہیں۔ میں اس گفتگو میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ان پر کیا الزامات لگائے گئے ہیں اور کیا ان الزامات کی حقیقت یا پس منظر ہے اور کون کیا کھیل کھیل رہا ہے۔ اس پر پہلے بھی بات ہو چکی ہے۔ میں اس وقت اس مسئلے کو اٹھانا چاہتا ہوں کہ وہ ہمارا ایک بہت بڑا قومی اثاثہ ہیں اور اس کو اس طریقے سے متاثر ہونے دینا، میں سمجھتا ہوں کہ قومی جرم ہو گا۔ اس لیے میں آپ کے توسط سے درد مندی کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم یہ مسئلہ پارٹی سیاست سے بالاتر ہو کر اٹھائیں۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اسے پوری امت مسلمہ کے ایک مسئلہ کے طور پر لیں۔ اس لیے کہ ڈاکٹر خان صرف پاکستان کا نہیں پوری امت مسلمہ کا اثاثہ ہیں۔

ماضی میں جو کچھ ہوا وہ اپنی جگہ، لیکن ان کی جان بچانا، ان کو مناسب مواقع دینا اور اس حبس گھٹن کی کیفیت سے نکالنا جس میں وہ گرفتار ہیں ہماری ذمہ داری ہے۔ جیسا کہ خبر میں خطرہ ظاہر کیا گیا ہے ان کی طبیعت کی خرابی اگر خدانخواستہ فالج کے حملے یا کوئی اور بری خبر تک پہنچتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ذمہ داری حکومت پر ہی نہیں بلکہ پوری قوم پر ہو گی۔ اس بناء پر میں آپ کے توسط سے جناب والا! اس مسئلے کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ حکومت اس معاملے کو سنجیدگی سے لے اور قوم کے جذبات کا احترام کرے۔ بیرونی حکومتوں کے مفادات کیا ہیں جوہری افزودگی کے حوالہ سے کس کس نے کیا کیا ہے یہ آپ کو معلوم ہے۔ اب تو یہ بات بھی سامنے آگئی ہے کہ بھارت اس میں ملوث ہے۔ دوسری جانب آپ کو معلوم ہے کہ جنوبی کوریا اپنے وسائل سے اس کام کو کر رہا ہے لیکن ایک خاص سیکنڈل کے ذریعہ جنوبی کوریا کے ساتھ ہمیں ملوث کیا جا رہا ہے۔ تاہم اس وقت میں اس سے ہٹ کر یہ بات کرتا ہوں کہ خالص انسانی بنیادوں پر اس مسئلے کو فوری لینا

چاہیے۔ میں اس بات کا مطالبہ کروں گا کہ حکومت اس ایوان میں ہمارے سامنے سارے حقائق رکھے۔ ڈاکٹر خان کے لیے زندگی کو آسان بنایا جائے اور جس بحران میں وہ اور پوری قوم مبتلا ہے اس سے انہیں نکالا جائے۔ (۲۹ اکتوبر ۲۰۰۴ء)

ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر پابندیاں

جناب چیئرمین! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے ایک نہایت ہی اہم قومی مسئلے کے بارے میں یہ نکتہ اٹھانے کا موقع دیا۔ میرے نکتے کا تعلق پاکستان، امت مسلمہ کے محسن ڈاکٹر اے کیو خان کے بارے میں ہے۔ میں اس سلسلے میں مختلف ذرائع سے بڑی تشویش ناک باتیں سن رہا تھا جس میں ان کو بار بار کی تفتیش، تذلیل اور سیکورٹی کے نام پر ان کے سماجی، خاندانی تعلقات، ان کی ملاقاتیں حتّٰی کہ اپنی اولاد اور ان کی نواسیوں تک سے ملاقات کو روکا جا رہا تھا۔ پھر یہ اطلاع آئی کہ ان کو دھمکایا گیا ہے کہ آپ کو قید تنہائی میں ڈال دیا جائے گا اور پھر جو گیسٹ ہاؤس تھا اس کے گیٹ کے پاس، ایک کمرہ خصوصیت سے اس طرح سے بنایا گیا کہ وہ کسی جیل خانہ سے کم نہیں۔ اور وہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتے۔ یہ ساری چیزیں ہو رہی تھیں، پھر یہ اطلاع آئی کہ ان کو ہسپتال لے جایا گیا ہے۔ کل کے ''جناح'' اخبار میں یہ شائع ہوا ہے (جس کی کاپی میں ابھی آپ کو اور لیڈر آف دی ہاؤس کو پیش کرتا ہوں) اس میں بتایا گیا ہے کہ ایسی کہانی بنائی جا رہی ہے جیسا کہ جرمنی میں عامر کے بارے میں کیا گیا تھا، کہ ان سے خودکشی کا خط لکھوا دیا جائے اور کہا جائے کہ گویا وہ شرمندگی سے بچنے کے لیے یہ اقدام کر لیں۔

جناب والا! یہ بڑا سنجیدہ معاملہ ہے۔ بلاشبہ جناح اخبار نے حکومت کے ترجمان شوکت سلطان صاحب کی تردید بھی چھاپی ہے اور میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کا بھی ذکر کروں۔ لیکن جو کچھ حکومتی ترجمان نے کہا ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے ڈاکٹر اے کیو خان کی رہائش کے باہر جو مشین لگائی ہے یہ ان کی حفاظت کے لیے ہے اور یہ کہ ان سے ملنے کے لیے کوئی

نہیں آ سکتا۔ مزید یہ کہ بیوی اور شوہر وہاں رہ رہے ہیں اور ان سے صرف ان کی بیٹی مل سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا نواسی اپنے نانا کو مارنے کے لیے کوئی اسلحہ، کوئی ہتھیار لائے گی؟ چلیے میں سیکورٹی کے لیے نگرانی کے ایک نظام کی ضرورت مان لیتا ہوں، لیکن مسئلہ ہے ملاقاتوں سے منع کرنے کا، ذہنی اذیت اور قید تنہائی کا اور طرح طرح کی ان دھمکیوں کا جو ڈاکٹر صاحب کو دی جا رہی ہیں۔

یہاں میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جناب جنرل پرویز مشرف نے گارڈین سے اپنے انٹرویو میں سر عام یہ بات کہی ہے کہ اے کیو خان کا مسئلہ ختم ہو گیا۔ اس سے پہلے انہوں نے یہ بات کہی ہے کہ ان پر صرف ملک سے باہر جانے پر پابندی ہے۔ ملک میں نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ شوکت سلطان صاحب نے یہ بات بھی کہی ہے کہ ان کے اَعِزّہ ان سے مل سکتے ہیں۔ لیکن میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ ان کے قریب تر اَعِزّہ حتّٰی کہ ان کی بہن اور بھائی تک کو ملنے نہیں دیا گیا۔ ابھی جب ایک اور سائنسدان ڈاکٹر فاروق کو سپریم کورٹ کے حکم کے تحت رہا کیا گیا ہے تو ان کو بھی اپنے گھر میں نظر بند کر دیا گیا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ اب یہ باب بند ہو چکا ہے لیکن فی الحقیقت جو دباؤ، اذیت اور جو سلوک ان لوگوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے وہ ایک قومی ذلت ہے۔

میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ ٹھیک ہے ایٹمی ہتھیار کی تیاری ایک ٹیم کا کام تھا۔ اس میں کسی کو انکار نہیں ہے، سب کا حصہ ہے اور اسی لیے ہم تمام سائنسدانوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ سربراہی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ہے۔ ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کہ کس نے وہ نیا طریقہ ڈیزائن کیا اور اس ملک کو دیا۔ جس پروسیس کو امریکہ نے اکیس سال میں حاصل کیا تھا اس کی ٹیم نے سات سال میں کر کے اس قوم کو دے دیا۔ ایسے فرد اور اس جیسے افراد کی آج بھی ہمیں ضرورت ہے اور کل بھی ہو گی۔

خدا کے لیے امریکہ پر بھروسہ نہ کیجیے۔ امریکی وزیر خارجہ کونڈولیزا رائس نے کانگریس کی کمیٹی کے سامنے اپنے بیان کے اندر صاف الفاظ میں یہ کہا کہ ہم نے یہ یقین کر لیا

ہے کہ پاکستان کے جوہری اثاثے کبھی بھی کسی ایسے ہاتھ میں نہیں جاسکتے جو اسے غلط استعمال کر سکے۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ امریکہ کو کیا حق ہے اس بات کا اور امریکہ کا یہ دعویٰ کہ ہم نے یہ یقینی بنایا۔ پاکستان کا اپنا کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم ہے اور میں سمجھتا ہوں وہ اچھا ہے اور اسے آئندہ بھی محفوظ ترین ہونا چاہیے، لیکن امریکہ کا یہ دعویٰ کرنا، یہ بہت ہی خطرناک چیز ہے۔ ان حالات کے اندر میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر عبدالقدیر کے ساتھ جو کچھ کیا جارہا ہے، وہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے۔ خدا کے لیے وہ راستہ اختیار کیجیے جو قومی غیرت ہی نہیں قومی تحفظ اور سلامتی کا تقاضا ہے۔

میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اے کیو خان کو دی جانے والی سہولتوں کے بارے میں جو دعویٰ کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اخبار میں جو خبر آئی ہے وہ کچھ اور بتاتی ہے۔ آج کے نوائے وقت میں حکومت کی طرف سے جو ایک سطری تردید دی گئی ہے کہ اے کیو خان پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے، میں اس کو چیلنج کرتا ہوں اور مطالبہ کرتا ہوں جناب چیئرمین! کہ آپ کی سربراہی میں یا ڈپٹی چیئرمین کی سربراہی میں وسیم سجاد، ایس ایم ظفر، میاں رضا ربانی اور مجھے موقع دیا جائے کہ ایک وفد کی صورت میں ہم جاکر اے کیو خان سے ملیں اور پوچھیں ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور اس ہاؤس کو آکر بتائیں کہ صورتحال کیا ہے؟ خبر کی جھوٹی تردید اسی طرح کی جارہی ہے جس طرح امریکہ نے وزیرستان پر حملہ کیا اور ہمارے ترجمان نے تحقیق کے بغیر یہ کہتے ہوئے تردید کر دی کہ نہیں یہ پاکستان کی سرزمین پر نہیں ہوا جبکہ پولیٹیکل ایجنٹ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ پاکستان کی سرزمین پر ہوا ہے۔

یہی معاملہ اے کیو خان کے حوالہ سے بھی ہو رہا ہے۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ تردید غلط ہے اور میں مطالبہ کرتا ہوں جناب چیئرمین! کہ آپ کی سربراہی میں ہم جانا چاہتے ہیں تاکہ انہیں ملیں اور دیکھیں کہ کیا پوزیشن ہے اور ایوان کو بتائیں اور اس طریقے سے اپنے ملک میں اپنے محسنین، اپنے سائنسدان جو پوری امت مسلمہ کا سرمایہ ہیں ان کی حفاظت میں اپنا کردار ادا کریں۔ ڈاکٹر خان کی خودکشی والی جو بات اخبارات میں آئی ہے، خدانخواستہ اگر

اس میں کوئی بھی صداقت ہے تو اس سے زیادہ شرمناک اور خطرناک بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ میں آپ کے ریکارڈ کے لیے آپ کو اور سینیٹر وسیم سجاد کو بھی یہ تراشہ دے رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں آپ ہمت کریں۔ سینیٹ کی کمیٹی جا کر ان سے ملے اور اگر ہمیں نہیں ملنے دیا جاتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تردیدی دعوے جھوٹ ہیں۔ اس ایوان کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ ہم ان سے مل سکتے ہیں اور ان سے ان کا حال دریافت کر سکتے ہیں تاکہ ہم قوم اور اس ایوان کو آکر بتا سکیں کہ حقائق کیا ہیں۔ (۱۲ مئی ۲۰۰۶ء)

ہسپتال میں ملاقات پر پابندی

جناب چیئرمین! میں اس تحریک استحقاق کو پیش کرنے کے لیے ایوان کی اجازت چاہتا ہوں۔

آغا خان ہسپتال کراچی میں، جہاں ڈاکٹر اے کیو خان کا آپریشن ہوا ہے وہاں مجھے انہیں دیکھنے کے لیے سیکورٹی ایجنسیوں نے اجازت دینے سے انکار کیا۔ میں اس رویے کے خلاف انتہائی بوجھل دل کے ساتھ تحریک استحقاق پیش کر رہا ہوں۔ اگرچہ یقین دلایا گیا تھا کہ ڈاکٹر خان کو دیکھنے اور اپنی اور سینیٹ میں میرے ساتھیوں کی جانب سے دعائیں اور نیک تمنائیں پہنچانے کے لیے خصوصی اجازت دے دی گئی ہے۔ میں چیئرمین سینیٹ کا جو اس وقت قائم مقام صدر بھی ہیں، شکر گزار ہوں جنہوں نے ذاتی طور پر مداخلت کی اور سینیٹ سیکرٹریٹ سے کہا کہ وہ میری ملاقات کے لیے اجازت حاصل کرے۔

یہ ۱۳ ستمبر کی نصف شب کے بعد کی بات ہے کہ مجھے چیئرمین کے مشیر جناب خالد لطیف نے، جو گزشتہ ۲۴ گھنٹوں سے اس معاملے کا پیچھا کر رہے تھے، مطلع کیا کہ اجازت مل گئی ہے اور میں ۱۴ ستمبر ۲۰۰۶ء کو صبح ۱۱ بجے ڈاکٹر خان سے مل سکتا ہوں۔ میں کراچی کے لیے سفر کے انتظامات کر چکا تھا اور ۱۱ بجے سے دس منٹ

قبل ہسپتال پہنچ گیا تھا۔ یہاں استقبالیہ میں ایک گھنٹہ ۲۵ منٹ میں نے انتظار کیا لیکن اس عرصہ میں سینیٹ سیکرٹریٹ کی کوششوں کے باوجود کچھ حاصل نہیں ہوا۔ مجھے ڈاکٹر خان کو محض پھولوں کا گلدستہ بھجوانے کے بعد واپس آنا پڑا۔ بہر حال میں نے ڈاکٹر خان کی صاحبزادی سے ملاقات کر کے ان تک اپنی دعائیں اور ساتھیوں کی ڈاکٹر خان کے لیے نیک تمنائیں پہنچائیں۔ ڈاکٹر خان کی صاحبزادی اور خود ڈاکٹر خان مایوس تھے کیونکہ وہ مجھ سے ملاقات کی توقع کر رہے تھے۔

یہ سلوک نہ صرف ایک ذہنی اذیت کا باعث ہے بلکہ اس کے ذریعہ ان تمام انتظامات کو سبوتاژ کیا گیا جو اس ملاقات کے لیے کسی اور کے نہیں بلکہ ملک کے قائم مقام صدر کے تعاون سے کیے گئے تھے۔ اس طرح میرے ذاتی استحقاق، سینیٹ اور چیئرمین سینیٹ اور سینیٹ کے افسران اور عملے کے استحقاق کی خلاف ورزی ہوئی ہے جنہوں نے اس ملاقات کے لیے انتظامات کے لیے اپنی بہترین کوششیں کیں۔ میں یہ تحریک پیش کرتا ہوں کہ سینیٹ اور اس کی استحقاق کمیٹی اس معاملہ پر غور کرے اور نمبر ایک معلوم کرے کہ کس نے اس ملاقات میں رکاوٹ ڈالی اور دوئم ایسے قواعد وضوابط کرے کہ مستقبل میں سینیٹ کے کسی رکن کے استحقاق کو اس طرح مجروح نہ کیا جائے۔

جناب چیئرمین! میں اپنی اس تحریک استحقاق میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ ڈاکٹر اے۔ کیو خان میرے ذاتی دوست ہیں اور میرے ان کے اس وقت سے روابط ہیں جب وہ طالب علم تھے اور ہندوستان سے آنے کے بعد میرے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے ڈی جے کالج کراچی میں پڑھ رہے تھے۔ ان کے یورپ میں قیام، پاکستان واپسی اور پھر آنے والے دنوں میں اس ملک کے لیے انہوں نے جو عظیم خدمات انجام دیں، اس پورے زمانے میں ہمارے بڑے گہرے اور اعتماد کے مراسم رہے۔ اگر آپ نے آج کے اخبار The Nation میں جنرل زاہد کا مضمون پڑھا ہو تو انہوں نے ہماری ایٹمی صلاحیت کی پوری کہانی بیان کی ہے

اور یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں یہ جو استعداد حاصل ہوئی ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس شخص کو یہ توفیق نہ دیتا تو ہم کبھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں (جنرل زاہد) اس پورے معاملے میں شروع سے لے کر آخر تک وابستہ رہا ہوں اور ان (ڈاکٹر عبدالقدیر خان) پر جو الزامات لگائے جا رہے ہیں، ان میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ اس ساری بات کو ہر ہر مرحلہ پر پیش نظر رکھنا انتہائی اہم ہے۔

اس وقت ہمارا وہ محسن [اے کیو خان] کینسر کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس ایوان نے ایک بار نہیں، کئی بار اس کی رہائی کا مطالبہ اور اس کی صحت یابی کے لیے دعا بھی کی ہے۔ اسی پس منظر میں آپریشن کے بعد میں ان سے ملنے کے لیے جانا چاہتا تھا۔ میں چیئرمین محمد میاں سومرو صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس سلسلہ میں ذاتی دلچسپی لی اور خود ٹیلیفون کیا۔ لیکن جناب والا! اس موقع پر یہ سوال اٹھانا ضروری ہے کہ ملک میں کس کی حکومت ہے؟ صدر کی یا ایجنسیوں کی؟ میری جانب سے درخواست کے بعد سینیٹ کا سٹاف چوبیس گھنٹے کوشش کرتا رہا اور ایک امید و بیم کی کیفیت تھی۔ بالآخر رات سوا بارہ بجے مجھے ٹیلی فون آیا کہ ہم آپ کو ناوقت تکلیف دے رہے ہیں، ہمیں ابھی اطلاع ملی ہے کہ اجازت مل گئی ہے، آپ صبح چلے جایئے اور گیارہ بجے کے بعد آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔ میں دس منٹ کم گیارہ پر وہاں پہنچ گیا اور ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کیا۔ ٹھیک ہے موقع پر موجود عملہ کے جو لوگ تھے وہ بیچارے بار بار معذرت اور شرمندگی کا اظہار کر رہے تھے۔ اپنے سے بالا افسروں سے مسلسل رابطہ کر رہے تھے۔ لیکن کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ جو وعدہ انہوں نے قائم مقام صدر (محمد میاں سومرو) سے کیا تھا، اسے پورا ہونا چاہیے۔ جبکہ دوسری جانب یہ اطلاع بھی موجود تھی کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی بیٹی میرے انتظار میں وہیں موجود تھی۔ اس کے ساتھ ہی جنرل چوہان بھی ان کے پاس بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن ان متعلقہ ذمہ داران اور ان کے عملہ نے ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرا کر بھی مجھے ملنے کا موقع نہیں دیا۔

جناب والا! میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی ذات کے بارے میں، اپنی سولہ سال کی

سینیٹ کی ممبر شپ میں کبھی بھی میں نے کوئی تحریک استحقاق پیش نہیں کی ہے۔ اگر تحریک استحقاق پیش کی ہیں تو مسائل پر کی ہیں اور ان پر کی ہیں جن کی وجہ سے سینیٹ کے قواعد کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ آج میں سینیٹ کے ساتھ ساتھ یہ ذاتی استحقاق کی خلاف ورزی بھی پیش کر رہا ہوں اور میں سمجھتا ہوں جناب والا! کہ سینیٹ کو اسے سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ یہ اس ایوان کی خود مختاری، اس کے وقار اور اس کے اختیار کا مسئلہ ہے۔ انٹیلی جنس ایجنسیاں یا ان کے بڑے ہوں یا چھوٹے، میں سب کی عزت کرتا ہوں، لیکن اگر ان کا یہ اختیار ہے کہ وہ صدر کے احکام کو نہ مانیں، اجازت دینے کے بعد اس پر عمل نہ کریں، تو پھر جناب والا! کون کہاں سے انصاف حاصل کرے گا۔ یہ ملک ایک جمہوری ملک ہے یا اس میں خفیہ ایجنسیوں اور فوج کی حکمرانی ہے؟ ان کے چہرے سے پردہ اٹھ گیا ہے۔ اس لیے ضروری سمجھتا ہوں جناب والا! کہ اس مسئلے پر آپ اور یہ ایوان مؤثر کارروائی کرے۔

(۱۸ ستمبر ۲۰۰۶ء)

ایٹمی پروگرام کی بحث عالمی تناظر میں

جناب چیئرمین! میں آپ کا انتہائی ممنون و مشکور ہوں کہ پوائنٹ آف آرڈر پر ایک اہم مسئلے کی طرف توجہ دلانے کا موقع دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسئلہ پاکستان ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ آج ۹ اگست ہے اور میں آپ کے توسط سے یاد دلانا چاہتا ہوں کہ انسانیت کی تاریخ کا ایک بہت ہی بڑا جرم ۶ اگست (۱۹۴۵ء) کو ہیروشیما پر امریکہ نے پہلا ایٹم بم پھینک کر کیا تھا۔ اس کے فوری بعد ۹ تاریخ کو ناگاساکی پر دوسرا بم پھینکا گیا۔ پہلا بم یورینیم کا تھا اور دوسرا پلوٹونیم کا تھا۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس وقت جاپان جنگ ہار چکا تھا اور ہتھیار ڈالنے کی گفتگو ہو رہی تھی۔ لیکن امریکہ نے ایک طرف اپنی بالا دستی کو قائم کرنے اور پوری دنیا کو دہشت زدہ کرنے کے لیے اور دوسری طرف سفید چمڑی کی برتری کا اظہار کرنے کے لیے یہ اقدام کیا۔ جنگ میں اگرچہ جرمنی بھی مدمقابل تھا اور جاپان کے مقابلہ میں بڑا دشمن تھا بلکہ ۱۹۳۹ء میں جنگ کا آغاز کرنے والا بھی جرمنی ہی تھا اور ہٹلر کے مظالم کا کوئی مقابلہ جاپان کی زیادتی سے نہیں کیا جا سکتا لیکن جرمنی کو سفید نسل کی بنا پر معاف کر دیا گیا اور جاپان کو ایٹم بم پھینک کر نشانہ بنایا گیا۔

اس واقعہ کا ایک بڑا پہلو یہ بھی تھا کہ جس طرح انسانوں کو ادویات کی افادیت چیک کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح امریکہ کو ایٹم بم کے اثرات کو جانچنے کے لیے تجربہ گاہ کی ضرورت تھی۔ ایسی تجربہ گاہ کہ جہاں انسانوں کو موت کی نیند سلا کر اور پورے علاقے کو ریڈیائی ذروں میں تبدیل کر کے وہ اپنی ٹیکنالوجی اور اپنے بموں کا تجربہ کرے۔ اس نے یہ کام ۶ اور ۹ اگست (۱۹۴۵ء) کو کیا اور محض تین دنوں میں دو لاکھ افراد لقمہ اجل بن

گئے۔ آٹھ سے دس لاکھ شدید زخمی ہوئے۔ یہ دونوں شہر، ہیروشیما اور ناگاساکی، گویا کہ صفحہ ہستی سے مٹ گئے اور پورا علاقہ غبار بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ یہ تھا وہ کارنامہ جو تہذیب کے علمبرداروں اور جمہوریت کی دعوت دینے والوں اور آمریت کے مقابلے میں جمہوریت اور آزادی کا نعرہ بلند کرنے والوں نے انجام دیا۔

جناب والا! بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ اس کے بعد یہ کوشش کی گئی کہ کسی دوسرے ملک کے پاس یہ ٹیکنالوجی نہ آنے پائے تاکہ وہ کبھی بھی امریکہ کو چیلنج نہ کر سکے۔ تاہم جب روس نے تین سال کے اندر اندر یعنی ۱۹۴۸ء میں یہ ٹیکنالوجی حاصل کر لی تو برطانیہ اور فرانس دونوں کو یہ ٹیکنالوجی منتقل کی گئی۔ یورینیم افزودگی کی تحدید (Non-Proliferation) کی دعوت دینے والوں اور سبق پڑھانے والوں نے منصوبے کے تحت یہ کارنامہ انجام دیا تاکہ روس کو کارنر کیا جا سکے اور جب چین نے اپنی محنت سے یہ صلاحیت حاصل کر لی تو پھر این پی ٹی (Non-Proliferation Treaty) کا فسانہ تیار کی گیا۔ ۱۹۷۶ء میں یہ معاہدہ اپنایا گیا اور اس معاہدہ کا نام یہ رکھا گیا گویا یہ ایٹمی افزودگی کی تحدید کے لیے ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ اس معاہدے کا مطالعہ کریں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ ابتدائیہ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ محض افزودگی روکنا کوئی حل نہیں ہے بلکہ اصل حل مکمل تخفیف اسلحہ ہے۔ کیونکہ تخفیف اسلحہ کے بغیر افزودگی کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ چند ممالک کی اجارہ داری قائم کر رہے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے کہ جس سے فوری رد عمل ہوتا ہے اور رد عمل ہوا۔ البتہ ساتھ ہی معاہدے کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ ایٹمی ٹیکنالوجی کو پر امن مقاصد کے لیے تمام دنیا کو فراہم کیا جائے گا۔ چنانچہ ایٹمی ہتھیار والے جو پانچ ممالک ہیں آرٹیکل ۲ کے تحت ان کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ باقی دنیا تک پر امن مقاصد کے لیے اس ٹیکنالوجی کو فروغ دیں اور فراہم کریں۔ جبکہ تیسری ذمہ داری یہ تھی کہ وہ خود بھی مزید تجربات نہ کریں۔

امریکہ نے ان تینوں نکات کی خلاف ورزی کی ہے۔ پوری کوشش یہ کی گئی کہ دنیا

کے دوسرے ممالک، خصوصاً مسلمان اور تیسری دنیا کے ممالک میں پر امن مقاصد کے لیے بھی ایٹمی ٹیکنالوجی نہ آئے۔ ہمارا راستہ روکا گیا، ایران کا روکا جارہا ہے اور خطرات ظاہر کر کے، اس کے پر امن مقاصد کے وعدے پورے نہیں کیے گئے۔ دوسری طرف امریکہ نے اپنے تجربات جاری رکھے۔ بلکہ در حقیقت اس کو مزید جدید ترین بنانے کے لیے اور ایک ٹن سے کم کی مقرر کردہ حد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انہوں نے ۷۰ گنا بڑا تجربہ کیا اور یہ عمل جاری رہا۔ اس کے بعد افغانستان میں ڈیزی کٹر جو ایٹمی ٹیکنالوجی ہی کا ایک مظہر ہے استعمال کیا گیا۔ جبکہ دوسری جانب اسرائیل کو پورے منصوبے کے تحت ایٹمی ٹیکنالوجی فراہم کی گئی، اسے اس طرح مسلح کیا گیا گویا اس کی ہر مشکل کو دور کرنا ضروری ہے۔

جناب والا! میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں انصاف اور امن اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ بڑی طاقتیں قانون کے تابع نہیں ہو جاتیں اور اس کا واحد راستہ یہی ہے کہ دنیا مکمل طور پر ایٹمی ہتھیاروں سے پاک ہو۔ لیکن اگر یہ نہیں ہے تو پھر اصول یہ ہونا چاہیے کہ دفاعی صلاحیت کے حصول پر دوسروں کو بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی بھی بڑی طاقت کا۔ اس اصول کے بغیر ان بڑی طاقتوں کے راستے کو روکا نہیں جا سکتا۔

اس تناظر میں آج دنیا بھر میں جاپان کے شہروں پر بمباری کی یاد میں جو احتجاج ہو رہا ہے، سیمینار ہو رہے ہیں، ریلیاں نکالی جارہی ہیں، چھ تاریخ کو شروع ہوئی ہیں اور آٹھ تاریخ تک جاری رہیں گی، ان سے اپنی مکمل یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے ہم یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ یا ایٹمی ہتھیاروں کا مکمل خاتمہ تمام عالمی قوتیں مشترکہ طور پر طے کر کے کریں اور جلد از جلد کریں ورنہ دوسروں کو بھی اس ٹیکنالوجی کے حصول کا اتنا ہی حق ہے۔

آج جس طرح امریکہ کے کہنے پر ہم نے اپنے نیوکلیئر سائنسدانوں کو تنگ کیا ہے وہ شرمناک ہے۔ اے کیو خان کے ساتھ جو مظالم کیے جارہے ہیں، یہ کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ اور جناب والا! آپ کو یاد ہو گا کہ اسی ایوان میں، میں نے اور میرے ساتھیوں نے اس مسئلے کو اٹھایا تھا اور یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہمارے وفد کو ڈاکٹر عبد القدیر خان سے ملنے کا موقع

دیا جائے۔ لیکن آج تک یہ موقع نہیں دیا گیا۔ اس دوران اگرچہ دوبار میں اس کے لیے خط بھی تحریر کر چکا ہوں۔ اسی طرح ایران کو تنگ کیا جارہا ہے یہ سارے کا سارا سامراجی کھیل ہے۔ اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ آج پوری دنیا میں امن کی جو تحریک ہے وہ مکمل طور پر ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمے کی تحریک ہے۔ اس پر عمل نہ ہو تو سب کو مواقع ملنے چاہییں اور کسی کی بالادستی اور اجارہ داری برقرار نہیں رہنی چاہیے۔

جناب والا! آپ کے توسط سے میں کہنا چاہتا ہوں کہ اس ایوان کے جذبات نہ صرف اپنے ملک بلکہ پوری دنیا تک امن کو قائم کرنے کے لیے پہنچیں کہ ہم سب مل کر اس دنیا کو ظلم سے پاک کرنا چاہتے ہیں اور جن ممالک نے حق کی بنیاد پر نہیں، محض قوت کی بنیاد پر اپنی بالادستی قائم کی ہوئی ہے انہیں اپنا رویہ تبدیل کرنا ہو گا۔ موجودہ طرز عمل گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا لازمی رد عمل ہو گا اور جیسا کہ خود ہنٹنگٹن (Samuel P. Huntington) نے کہا ہے کہ جن ممالک کے پاس روایتی طاقت سے اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہو گی وہ دوسرا راستہ اختیار کریں گے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ Terrorism is the weapon of the weak against the strong آپ دنیا سے دہشت گردی ختم نہیں کر سکتے جب تک سب قانون کے تابع نہ آئیں اور انصاف میں سب برابر نہ ہوں۔ سب کو قانون کے تابع کر لیجیے پھر ہی امن قائم ہو گا۔ ان جذبات کے ساتھ میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کے اور اس ایوان کے توسط سے پوری دنیا کے امن کے لیے کام کرنے والوں کے ساتھ مکمل یکجہتی کا اظہار کرتا ہوں۔

(۹ اگست ۲۰۰۶ء)

سفارت کاری کے آداب، امریکی رویہ اور ہمارا طرز عمل

بین الاقوامی تعلقات کا ایک اہم میدان سفارت کاری ہے۔ سفارت کاری محض رسمی طور پر چند فرائض ادا کر دینے کا نام نہیں، نہ ہی یہ محض ان چند لوگوں کے ذریعہ رسمی طور پر سرانجام دی جاسکتی ہے جنہیں سفارت کاری کے منصب پر فائز کیا جاتا ہے۔ مؤثر سفارت کاری کے لیے واضح وژن اور جامع حکمت عملی کے ساتھ ساتھ باہم مربوط اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ دوطرفہ تعلقات میں سامنے آنے والا ہر چھوٹا بڑا واقعہ اور اس پر ردعمل یا خاموشی تعلقات کی نوعیت اور گہرائی کو متعین کرتا ہے۔ اس باب میں پاک امریکہ تعلقات سے جڑے ایسے ہی چند بظاہر چھوٹے لیکن سفارت کاری کے نقطہ نظر سے اہم واقعات میں حکومتی طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے درست طرز عمل کی نشان دہی کی گئی ہے۔

سفارت کاروں کی تعیناتی

جناب چیئرمین! میں بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے ایک نہایت ہی اہم موضوع پر یہ پوائنٹ آف آرڈر اٹھانے کا موقع دیا۔ خبریں تو تقریباً دوماہ سے آرہی تھیں کہ بدنام زمانہ گوانتاناموبے کی شہرت رکھنے والے وہاں کے انچارج Major General J. Hood کو اب پاکستان پر نازل کیا جارہا ہے۔ البتہ اس خبر کی تائید نہ واشنگٹن سے ہو رہی تھی اور نہ یہاں ہماری حکومت اس بارے میں منہ کھول رہی تھی۔ تاہم اب ایک ویب سائٹ پر دی گئی اطلاع سے راز فاش ہوا اور پھر بات سرکاری طور پر ریکارڈ پر بھی آگئی ہے کہ موصوف کو اسلام آباد میں امریکہ کے سفارت خانے میں نہایت ہی اہم مقام پر متعین کیا گیا ہے۔ امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ، جس میں ہمارے کندھوں کو استعمال کر کے ہمارا ہی

خون بہایا جارہا ہے اور ہماری فوجوں کو ہمارے شہریوں کے خلاف صف آراء کیا گیا ہے، اس کام کی نگرانی، رہنمائی اور رابطے ان کی ذمہ داری ہوگی۔ اور خاص طور پر جمہوری حکومت آنے اور مشرف صاحب کے کمزور ہونے کے بعد ان کو جو اختیارات چاہیے ہیں، جن کا اس سے پہلے اپنے مطالبات کے سلسلے میں وہ (امریکی) اظہار کر چکے ہیں، ان تمام چیزوں کو بروئے کار لانے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

جناب والا! مجھے اجازت دیں کہ میں یہ بھی بتاؤں کہ آج کے اخبار The News میں صحافی ماریانہ بابر نے بڑی تفصیل سے اس بارے میں تمام چیزوں کو پیش کیا ہے۔ میں انہیں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے قوم کی توجہ ایک ایسے اہم موضوع کی طرف مبذول کرائی ہے جس کے بارے میں جاننے کے لیے اس سے پہلے ہم سب کوشش کر رہے تھے۔ جتنی معلومات ان کی رپورٹ میں دی گئی ہیں، وہ آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں۔ جناب والا! یہ میجر جنرل ہڈ اپنے تشدد اور ناٹکوں کے معاملات میں بڑی بدترین روایات رکھتے ہیں لیکن سب سے شرمناک پہلو یہ ہے کہ ان کے دور نگرانی میں گوانتاناموبے میں شدید مظالم اور تشدد وہاں کے معصوم قیدیوں پر کیا گیا ہے۔ میں یہ لفظ ''معصوم'' سوچ سمجھ کر استعمال کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ ایک دو نہیں چار، پانچ سو افراد ایسے ہیں جو وہاں پر چار سے پانچ سال تک محبوس رہے ہیں۔ وہ تشدد کا نشانہ بنائے گئے اور ان کی اس قدر بے عزتی کی گئی ہے کہ بالآخر انہوں نے احتجاجاً بھوک ہڑتالیں تک کیں۔ تاہم وہ معصوم ثابت ہوئے اور جب ان پر کوئی الزام نہیں لگایا جاسکا، تب انہیں چھوڑا گیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ ایک وقت میں وہاں پر ایک ہزار سے زیادہ افراد قید تھے۔ اس وقت بھی مختلف اندازوں کے مطابق تین سے چار سو کے درمیان قیدی وہاں موجود ہیں۔ اس دوران جو قیدی وہاں سے چھوڑے گئے ہیں، ان میں سے تین، چار کے علاوہ کسی پر بھی الزام تک نہیں لگایا جاسکا کہ سزا دی جائے۔ سوڈان کا ایک نوجوان جو ابھی پچھلے ہفتے چھوٹا ہے، اس نے چھ برس وہاں گزارے ہیں۔ وہاں کے حالات بیان کرتے ہوئے اس کا کہنا ہے کہ اس نے

۴۰ دن بھوک ہڑتال کی۔ اس نے بتایا ہے کہ کس کس طریقے سے اس کے دین اور عزت و ناموس کی توہین کی گئی اور سب سے بڑھ کر قرآن پاک کی بے حرمتی کی گئی ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ بیان کروں کہ کہاں کہاں قرآن پاک کے صفحات کو ناپاک کیا گیا ہے۔

اور یہ اس دور کی بات ہے جب یہ شخص اس کیمپ کا انچارج تھا، اس پر پوری دنیا میں واویلا ہوا اور اس سب کے باوجود امریکہ کا یہ اپنی طاقت پر غرور ہے کہ اس نے ایک ایسے فرد کو نہ صرف یہ کہ چارج شیٹ نہیں کیا، بلکہ اس کے خلاف اس سے کمتر کوئی کارروائی بھی نہیں کی گئی۔ اس نے بڑی رعونت کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں قانون کا خیال نہیں رکھا جاسکتا۔ اس کے بعد اب اس بدنام زمانہ شخص کو پاکستان پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ ہمارے لیے یہ شرم کی بات ہے کہ پاکستان کی حکومت نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، ہم کم از کم یہ دیکھتے کہ یہ ناپسندیدہ شخص ہے۔ سفارتی اخلاقیات کی رو سے یہ ہمارا حق ہے۔ پاکستان ایک خود مختار ملک ہے، امریکہ کی کوئی محکوم ریاست نہیں ہے لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ امریکی سفیر یہاں وائسرائے کا مقام رکھتا ہے۔ یہ خدشات کسی طرح بھی غلط نہیں ہیں کہ امریکہ کا یہ فوجی کمانڈر یہاں آکر ہماری فوجوں کو استعمال کرنے کی کوشش کرے گا۔

جناب والا! یہ ہماری قومی عزت اور آزادی کا مسئلہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ نئی حکومت کو فوری طور قدم اٹھانا چاہیے کہ ایسے شخص کو ناپسندیدہ شخص قرار دے کر ملک سے بے دخل کرنے کے لیے نوٹس دیا جائے۔ ہم میں اگر یہ جرأت نہیں ہے تو پھر جمہوریت اور قانون کی بالادستی کے اور اسلام سے وفاداری کے ہمارے سارے وعدے غیر حقیقی اور بے وزن ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان سب دعووں پر اوس پڑ جائے گی۔ جناب والا! میں کم از کم الفاظ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ بلا تاخیر حکومت کو اس معاملے میں فوری اقدام کرنا چاہیے اور میں پاکستانی پریس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس مسئلے کو اٹھا کر پوری قوم کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔ (۵ مئی ۲۰۰۸ء)

سفارت کاروں کا پارلیمنٹ سے رابطہ

جناب چیئرمین! بلوچستان کے سلسلے میں میرے ساتھیوں نے جو باتیں کہی ہیں وہ ہم سب کے دل کی آواز ہیں اور خصوصیت سے آپ اس وقت جس مقام پر ہیں مجھے توقع ہے کہ آپ اس معاملے میں ضرور ایسے اقدام تجویز کریں گے جس سے جو مستقل خلاف ورزیاں ہیں وہ کسی طرح رک سکیں۔ لیکن میں اس سے ذرا ہٹ کر ایک مسئلہ اٹھا رہا ہوں۔

درحقیقت میں بہت سوچتا رہا ہوں کہ اس کو اٹھاؤں یا نہ اٹھاؤں۔ تاہم مسئلہ کی حساسیت کی بناء پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسے آپ کے سامنے رکھوں۔ کئی دن سے یہ افواہیں مجھ تک آرہی تھیں کہ افغانستان میں نیٹو کے امریکی کمانڈر جنرل ڈیوڈ میکنن (General David McKiernan) اسلام آباد آرہے ہیں۔ ان کی آمد کا خاص پس منظر بتایا جارہا ہے اور یہ پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں سرحدوں کی خلاف ورزی کے بارے میں متفقہ طور پر منظور ہونے والی قرارداد سے متعلق ہے۔ آپ کو علم ہے کہ قرارداد پر عمل درآمد کی کمیٹی بھی بنی ہے اور اس کے ساتھ وزیراعظم کی جانب سے معمول سے تھوڑا ہٹ کر بیانات آئے ہیں۔ ان بیانات میں پاکستان کی سرحدوں کی مسلسل خلاف ورزی پر مجبوراً اور بہت ہی ادب سے وزیراعظم اختلاف اور احتجاج کررہے ہیں۔ اس مجموعی تناظر میں جنرل صاحب تشریف لارہے ہیں تاکہ وہ اراکین پارلیمنٹ کو بریف کریں۔

مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا تھا لیکن کل کے "Dawn" میں اس کے بارے میں ایک خبر بھی آئی، پھر بھی یقین ماننے کہ مجھے تردد تھا کہ میں اس پر بات کروں یا نہ کروں، لیکن آج تقریباً ایک بجے مجھے امریکی سفارت خانے سے فیکس ملا جس میں محترمہ سفیر صاحبہ نے مجھے بھی دعوت دی ہے کہ ہم اراکین پارلیمنٹ کے لیے یہ بریفنگ کررہے ہیں اور آپ اس میں آئیں۔ میں نے فوری طور پر انکار میں اس کا جواب دیا، اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ پارلیمنٹ کی توہین ہے۔ ہر کام کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ ہم ان کے کوئی غلام نہیں ہیں کہ

جس کا دل چاہے، جس سے چاہے ملے اور جو چاہے تقریریں فرمائے۔ ہر کام کا ایک طریقہ کار اور آداب ہوتے ہیں۔ اگر نیٹو کے کمانڈر کو کوئی بات ہم تک پہنچانی تھی تو امریکی سفارت خانہ کا فرض تھا کہ وہ دفتر خارجہ سے رابطہ کرے۔ یہ دفتر خارجہ کا کام ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے ارکان یا جس سے بھی بریفنگ منعقد کروانا چاہے کروائے۔ دوسری جانب اگر پارلیمنٹ یہ ضرورت محسوس کرتی کہ ہمیں کسی معاملے میں بریفنگ کی ضرورت ہے تو بلاشبہ اس کا انتظام ہو سکتا ہے، لیکن یہ ایک قسم کی لابنگ ہے اور پارلیمنٹ کی متفقہ قرار داد کو رد کرنے کی ایک کوشش ہو رہی ہے کہ مسلسل اور روزانہ بچیوں اور معصوم انسانوں کو جس طرح شہید کیا جارہا ہے اس پر رد عمل کیوں دیا جارہا ہے۔

اور یہ دوسرا جرم ہے جو پارلیمنٹری ارکان کے لیے بریفنگ کے نام پر کیا جارہا ہے۔ یہ پارلیمانی آداب، سیاسی روابط، سفارتی مذاکرات کے تمام معروف اصولوں کے خلاف ہے، اس لیے میں اس پر احتجاج کرتا ہوں۔ میں قائد ایوان سے درخواست کروں گا کہ دفتر خارجہ سے معلوم کریں کہ کیا دفتر خارجہ کو اعتماد میں لیا گیا ہے؟ اسے کیوں نظر انداز کیا گیا؟ دفتر خارجہ کا کیا رد عمل ہے؟ دفتر خارجہ نے خود کیوں اس بات کا نوٹس نہیں لیا؟ کیا اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ جس ایمبیسی کا دل چاہے، وہ جس قومی مسئلے پر چاہے، اس طریقے سے معاملے میں مداخلت کرے؟ ہم ایک آزاد ملک ہیں۔ ہم باعزت لوگ ہیں اور اگر ہم خود اپنی عزت نہیں کریں گے تو دوسرے بھی ہماری عزت نہیں کریں گے، اس لیے میں نے ضروری سمجھا جناب چیئرمین! کہ آپ کی اجازت سے میں اس ایوان کو اور پوری قوم کو بھی اعتماد میں لوں کہ پاکستانی قوم اپنی عزت اور اپنی آزادی کی حفاظت کرنا جانتی ہے اور ان شاء اللہ اس پر حرف نہیں آنے دے گی۔ (۱۳ نومبر ۲۰۰۸ء)

سفارتی وفود کی آمد

بڑی اہم خبر یہ ہے کہ امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس صاحب ہندوستان کی یاترا

کرنے کے بعد ہمارے یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ اطلاعات ہیں کہ ان کے ساتھ ۱۲۵ افراد وفد میں آئیں گے اور موضوع ہے افغان پالیسی۔ مجھے بتائیں کہ یہ کیا کھیل ہے۔ میرے خیال میں تاریخ میں پہلی مرتبہ اتنا بڑا امریکی وفد ہمارے یہاں آرہا ہے اور میرے علم کی حد تک خود امریکہ کی تاریخ میں بھی شاید ہی کبھی اتنا بڑا وفد بھیجا گیا ہو گا۔ خبروں میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس وقت اسلام آباد کے امریکی سفارت خانے میں جو فوجی افراد ہیں وہ ۴۴ ہیں اور ان کی تعداد بڑھا کر ۲۸۰ کی جا رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ سفارت خانہ ہے یا کوئی فوجی اڈا ہے؟ پتا نہیں کب سے یہ فوجی کیمپ کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ یہ بہت ہی سنجیدہ سوال ہے اور اس پس منظر میں جبکہ اطلاعات یہ بھی ہیں کہ پاکستان کی حکومت نے ویزہ دینے میں تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ ۱۲۵ افراد کا اس طرح آنا بہت سے سوالات پیدا کرتا ہے۔ جناب والا! جس طرح امریکہ کی مختلف ایجنسیاں، بلیک واٹر جس کا نام بدل کر Xe رکھ دیا گیا اور دوسرے ادارے ہمارے معاملات کے اندر دخیل ہو رہے ہیں وہ نہایت تشویشناک ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ویزوں کے بارے میں ہمارے تحفظات سے بچنے کے لیے یہ ۱۲۵ افراد وفد کی شکل میں تشریف لا رہے ہیں۔ یہ بڑا خطرناک کھیل ہے اور جیسا کہ قومی سلامتی کی قرارداد میں کہا گیا ہے ہمیں یقینی بنانا چاہیے کہ امریکہ کے قدموں کے نشان شفاف ہوں اور پاکستانی قانون کے تحت ہوں۔ ہمیں دوطرفہ تعلقات میں ایسی چیزوں کو استعمال کرنے کا کوئی بھی موقع فراہم نہیں کرنا چاہیے۔

(۱۸ جنوری ۲۰۱۰ء)

امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس کا بیان

جناب چیئرمین! میرے پوائنٹ آف آرڈر کا تعلق آج اسی مسئلے سے ہے جس کی طرف راجہ ظفر الحق صاحب نے متوجہ کیا ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں آپ کو تحریری نوٹس بھی بروقت بھیج دیا تھا۔ جناب والا! راجہ صاحب کی بات کی تائید کرتے ہوئے جن پہلوؤں کی

طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں ان میں پہلا یہ ہے کہ ممبئی کا واقعہ ایک شرمناک، تکلیف دہ اور قابل مذمت واقعہ ہے۔ پاکستان کی حکومت نے اور پاکستان کے عوام نے اس کی مذمت کی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک سال ہونے کے باوجود خود بھارت میں ابھی تک ان کی عدالتیں اس معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکیں۔ جو رودادیں اب آرہی ہیں اور وہاں کے اخبارات میں برابر دیکھ رہا ہوں، بشمول ان کے اداریوں کے، ان میں یہ بات کھل کر سامنے آرہی ہے کہ ممبئی کے واقعہ میں بنیادی کارپرداز بھارتی تھے۔ حال ہی میں ایک کتاب اس کے بارے میں شائع ہوئی ہے جس میں ممبئی میں اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈ کے چیف ہیمنت کرکرے کے قتل کا پورا بیک گراؤنڈ دیا گیا ہے اور یہ سارا پس منظر ممبئی کے واقعہ کے متعلق ہے۔ ایک ایسے واقعے کو امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے بنیاد بنایا ہے کہ ہندوستان پاکستان پر حملہ کر سکتا ہے حالانکہ ابھی یہ طے ہی نہیں کہ واقعہ ہوا کیسے ہے۔

دوسرا پہلو بین الاقوامی قانون سے متعلق ہے۔ ایسے واقعات کہیں بھی ہوں بشمول ۹/۱۱ کسی ملک کو اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت اس بات کا اختیار نہیں ہے کہ اس قسم کے واقعے کو جنگ قرار دے کر کسی خود مختار و آزاد ملک کے اوپر حملہ کر دے۔ امریکہ نے [افغانستان اور عراق کے حوالہ سے] جو کچھ کیا اس وقت اس پر بحث ہو رہی ہے۔ کتابیں آرہی ہیں۔ یہ بین الاقوامی قوانین کے خلاف ہے۔ تو جناب والا! رابرٹ گیٹس کا پاکستان پر حملے کے حوالہ سے اتنا خطرناک بیان دینا ایک طرف انڈیا سے ان کا اتحاد ظاہر کر رہا ہے لیکن دوسری طرف جو کھیل پاکستان کے خلاف وہ کھیلنا چاہتے ہیں اور جس طرح بھارت کی وہ حوصلہ افزائی کر رہے ہیں کہ اس قسم کا کوئی جھوٹا بہانہ کر کے پاکستان پر حملہ آور ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ حکومت پاکستان کو صاف کہنا چاہیے کہ رابرٹ گیٹس اس وقت تک پاکستان نہیں آسکتے جب تک وہ اپنا بیان واپس نہ لیں۔ انہیں یہاں نہیں آنے دیا جائے۔ وقت ہے کہ ان کو کہہ دیں کہ شکریہ اپنے ملک میں واپس جائیے۔ ہم آپ کی میزبانی نہیں کر سکتے۔

(۲۱ جنوری ۲۰۱۰ء)

افغانستان میں متعین امریکی سفیر کی دھمکی

جناب چیئرمین! ایک پہلو کی طرف آپ کو متوجہ کروں گا اور وہ یہ ہے کہ جس طرح پاکستان کی حکومت نے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ کے ساتھ نتھی کر لیا ہے اور اب اس کے ساتھ گھسٹتے چلے جا رہے ہیں وہ پاکستان کی سلامتی اور خود مختاری کے لیے تباہ کن ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر پاکستان کے اندر، مسلم امت میں، پوری تیسری دنیا میں اور دنیا بھر میں اور عالم انسانیت میں پاکستان مخالف شدید جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ عالم انسانیت کے معنی وہ چند حکومتیں نہیں ہیں جو امریکہ کی اتحادی ہیں، بلکہ وہ لاکھوں، کروڑوں انسان ہیں جو جنگ کے خلاف اور امریکہ کے تشدد کے خلاف خود امریکہ سے لے کر استنبول اور پاکستان تک مضطرب ہیں اور احتجاج کر رہے ہیں۔

ہم نے امریکہ کے ساتھ تعاون کی کوشش میں اپنے آپ کو تنہا کر لیا ہے اور ہمیں اس کا نتیجہ یہ ملا ہے کہ امریکہ کے افغانستان میں سفیر زلمے خلیل زاد نے یہ بیان دیا ہے کہ جو حکم ہم دے رہے ہیں پاکستان وہ پورا کرے ورنہ ہم خود پاکستان کے علاقے میں مداخلت کریں گے اور فوج بھیجیں گے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ بیان سفارتی آداب کے منافی اور کھلی کھلی دھمکی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جو وضاحت اس بیان پر اعتراضات کے بعد ہماری جانب سے آئی ہے وہ اس سے زیادہ شرمناک ہے۔ ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کہ وہ ہمارے بیان کے باوجود اپنی بات سے پلٹا نہیں۔ امریکی سفیر کا وہ پورا بیان ویب سائٹ پر موجود ہے اور پڑھا جا سکتا ہے کہ اس نے کیا کہا۔

تو جناب والا! یہ پاکستان کے منہ پر ایک تمانچہ ہے۔ یہ ہماری خارجہ پالیسی کی ناکامی ہے اور اس کے جواب میں جو گو نگارد عمل بد قسمتی سے ہمارے دفتر خارجہ کے ترجمان اور میرے محترم وزیر اطلاعات نے دیا ہے وہ بھی میری نگاہ میں افسوس ناک اور شرمناک ہے کہ جی ہماری زمین پر اب کوئی نہیں آئے گا۔ سوال یہ ہے کہ جب وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم آپ پر حملہ

کریں گے تو پھر جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ کر کے دیکھ لو۔ یہاں تمہارا مقابلہ صرف نام نہاد دہشت گردوں سے نہیں ہو گا بلکہ پاکستان کی فوج، قبائلی لشکر، پاکستانی عوام اس کی مزاحمت کریں گے، اسی طرح جس طرح عراق میں لوگ تمہاری مزاحمت کر رہے ہیں۔

یہ مسئلہ بہت اہم ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے پر اور اس کے جتنے بھی اثرات ہیں ان پر ہم غور کریں۔ کیوں کہ افغانستان کا استحکام، افغانستان کے لیے بھی، پاکستان کے لیے بھی اور اس پورے علاقے کے لیے بھی ضروری ہے جبکہ امریکہ کی مداخلت اور موجودگی نے اس پورے خطے کو غیر مستحکم کر دیا ہے۔ عراق میں آج آگ لگی ہوئی ہے اور گھر گھر اور محلے محلے میں لڑائی ہو رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہاں کس طریقے سے عوام اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور ایڈورڈ کینیڈی (Edward Kennedy) یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ بش کا ویت نام عراق بن رہا ہے۔ بد قسمتی سے اس ویت نام میں ہم اس کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ اقبال نے تو بڑا صحیح کہا تھا کہ ؎

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

تو آج جو امریکہ کے رندے ہیں وہ امریکہ کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑ کر کے دراصل نہ صرف اپنی خارجہ پالیسی اور اپنے ملک کی سیکورٹی کو خطرے میں ڈال رہے ہیں بلکہ پوری امت مسلمہ اور عالم انسانیت سے علیٰحدہ ہو رہے ہیں۔ اس لیے میں یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ امریکہ کی جانب سے اس قسم کے بیانات کے بارے میں کوئی معذرت خواہانہ مؤقف نہ اپنایا جائے بلکہ مؤثر جواب دیا جائے۔ اپنی خارجہ پالیسی کو جس آزاد فضا کی ضرورت ہے اسے آپ فراہم کیجیے۔ آپ نے جن مجبوریوں کے تحت بھی نائن الیون میں ان کا ساتھ دیا ہو، میں اس سے اتفاق نہیں کرتا اور قطعاً متفق نہیں ہوں لیکن آج تو دنیا کی صورت حال بھی بدل گئی ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی پالیسی پر فوری نظر ثانی کریں۔

یہ جو نیٹو سے باہر کے اتحادی کی بات کہی گئی ہے اس کو امریکہ کے منہ پر دے مارے، ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ہمیں اس طرح سے امریکہ کا کاسہ لیس بن کے نہیں رہنا۔ تو جناب والا! یہ مرکزی مسئلہ ہے اور میں اپوزیشن کی طرف سے مطالبہ کروں گا کہ حکومت جلد از جلد خارجہ پالیسی کے موضوع پر اور خاص طور پر افغانستان، عراق اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے اور اس سے جس طرح ہم نتھی ہو گئے ہیں، اس پر ہمیں بریفنگ دے اور وہاں ہمیں بات کرنے کا موقع بھی دیں۔ میں رضا ربانی صاحب کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ یہ خواہ کھلے اجلاس میں ہو یا کارروائی بند کمرے میں کی جائے لیکن یہ فوری منعقد ہونا چاہیے۔ میری نگاہ میں ۱۱ویں اجلاس کے اندر اس کو ایجنڈے پر لانے کی ضرورت ہے۔

(۹ اپریل ۲۰۰۴ء)

پارلیمنٹ کی کارروائی پر امریکی سفیر کی پیشکش

جناب چیئرمین! میرے پوائنٹ آف آرڈر کا موضوع تو ایک ہے لیکن اس کے دو پہلو ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ڈرون حملے گزشتہ کئی برس سے جاری ہیں لیکن امریکی صدر باراک اوبامانے دو روز قبل دیے گئے ایک انٹرویو میں گیارہ سال میں پہلی مرتبہ سرکاری طور پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ پاکستان کی سرزمین پر ڈرون حملے کیے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے امریکی وزیر دفاع لیون پنیٹا (Leon Panetta) نے ایک بار ضرور یہ بات کہی تھی ورنہ عام طور پر یہ کھیل آنکھ مچولی کی طرح کھیلا جا رہا تھا۔ چنانچہ ایک جانب مسلسل حملے بھی ہو رہے تھے جن میں تین ہزار سے زائد لوگ شہید ہو چکے ہیں۔ دوسری جانب جو لوگ ان حملوں کا اعلانیہ ہدف ہیں مرنے والوں میں ان کی تعداد دو، تین درجن سے زیادہ نہیں ہے، باقی سارے معصوم شہری مارے گئے ہیں۔ البتہ یہ پہلا موقع ہے کہ امریکہ کے صدر نے عوام کے سامنے اعلان کیا ہے کہ ہاں یہ ہم نے کیا ہے اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ وہ آئندہ کے

لیے بھی کہہ رہے ہیں کہ ہم یہ کریں گے۔

جناب والا! بین الاقوامی قانون میں یہ صورت حال جنگ کا عمل ہے اور اس میں کوئی تنازعہ یا اختلاف رائے نہیں ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل، انٹرنیشنل کورٹ آف جیورٹس اور ہیومن رائٹس واچ اور امریکہ کے بین الاقوامی قانون کے کم از کم دو درجن پروفیسر یہ بات لکھ چکے ہیں کہ متعلقہ ملک کی شرکت کے بغیر ڈرون حملے ایک جنگی حرکت ہے جو اقوام متحدہ کے چارٹر کے خلاف ہے۔ اب یہ چیز اعلانیہ ہوئی ہے اور اس کے بعد ہمارے دفتر خارجہ کا بیان آیا ہے۔ میرے نزدیک دفتر خارجہ کا یہ بیان بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ اس بیان میں یہ تو ضرور کہا گیا ہے کہ یہ حملے ناقابل قبول ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا دیا گیا ہے کہ اس کا فائدہ بھی بہت ہوا ہے۔

اس سے زیادہ شرمناک بات کیا ہو سکتی ہے؟ اس لیے جناب والا! میں کہتا ہوں کہ وزیر دفاع، وزیر خارجہ اور خود وزیر اعظم صاحب اس معاملے کو براہ راست لیں اور یہ حقیقت بھی سامنے رکھیں کہ اس پارلیمنٹ نے اس سے پہلے اپنی دو قراردادوں اور پارلیمانی کمیٹی نے اپنی سفارشات میں واضح طور پر یہ کہا ہے کہ ڈرون حملے خطرے کی لکیر کے نیچے ہیں اور اگر یہ جاری رہتے ہیں تو یہ ہماری خود مختاری پر حملہ ہے۔

دوسری بات جو اور بھی پریشان کن ہے، وہ آج کے اخبارات میں پاکستان میں متعین امریکی سفیر کا بیان ہے۔ اس بیان میں اس نے کہا ہے کہ پارلیمنٹ بات چیت کے جو حوالے طے کر رہی ہے وہ ہمارے لیے قابل گفتگو ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ امریکی سفیر کو یہ تفصیلات کیسے معلوم ہوئیں کیونکہ ابھی تک تو یہ معلومات پارلیمنٹ کے سامنے بھی نہیں آئی ہیں۔ میں بھی اس کمیٹی کا رکن ہوں اور حلف لیے ہوئے ہوں کہ جب تک کوئی چیز طے نہیں ہو جاتی، کمیٹی کی کارروائی کے بارے میں کوئی بات کہیں ذکر نہ کی جائے گی۔ مجھ سے ملکی اور غیر ملکی میڈیا نے بار بار رابطہ کیا ہے لیکن میں نے اس کے مندرجات کبھی باہر نہیں نکالے۔ امریکی سفیر یہ کیسے کہہ رہا ہے کہ وہ شرائط وضوابط قابل گفتگو ہیں؟

یہ دونوں معاملات بہت خطرناک ہیں اور میں چاہوں گا کہ آپ متعلقہ وزراء سے کہیں کہ وہ اگلے اجلاس میں آکر اس بات کی وضاحت کریں کہ یہ دونوں معاملے کیا ہیں۔ یعنی جنگ کی حرکتوں کے بارے میں ہمارا کیا سنجیدہ مؤقف ہے۔ درحقیقت باراک اوباما کے بیان کے بعد اب بلی تھیلے سے باہر آگئی ہے اور اب کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں رہی۔ دوسری جانب سفیر صاحب نے جو بیان دیا ہے، اس کی بنیاد کیا ہے؟ ان کو زیر بحث سفارشات کس نے دی ہیں؟ وہ ان تک کیسے پہنچی ہیں؟ میرے خیال میں یہ اس ایوان کے لیے یہ دونوں مسائل بہت اہم ہیں۔ (۳فروری ۲۰۱۲ء)

سیکرٹری خارجہ کی سبکدوشی

جناب والا! میرا پوائنٹ آف آرڈر وزارت خارجہ سے متعلق ہے۔ میں اس موقع پر بہت اختصار کے ساتھ کل کے اخبارات میں آئی خبر پر بات کرنا چاہوں گا کہ خارجہ سیکرٹری کو بیک بینی و دو گوش غیر شائستہ طریقے کے ساتھ ہٹا دیا گیا ہے۔ اخباری رپورٹ میں شائع شدہ تفصیل کے مطابق خارجہ سیکرٹری نے خود اس بات کا اظہار کیا تھا کہ اگر ہماری سوچ میں ہم آہنگی نہیں تو میں معاہدہ کے مطابق ستمبر ۲۰۰۸ء تک کام جاری رکھنے کے بجائے چاہوں گا کہ مجھے مئی میں ہی فارغ کر دیا جائے۔ پس منظر کے طور پر خبر میں بتایا گیا ہے کہ ایک اہم مسئلے پر خارجہ سیکرٹری نے ایک ایسی رائے کا اظہار کیا تھا جو موجودہ حکمرانوں کی رائے سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا اس لیے کہ یہ ایک حساس مسئلہ ہے۔ لیکن میں اصولی بات کہنا چاہتا ہوں کہ بیوروکریسی اور پالیسی امور میں شریک ماہرین کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی بھی زیر بحث موضوع پر کھل کر اپنی دیانتدارانہ رائے ظاہر کریں۔ محض سیاسی قیادت کے اشارہ چشم ابرو کو دیکھ کر رائے دینا بلالحاظ اس کے کہ قانون، دستور، بین الاقوامی روایات اور پاکستان کے مفادات کیا تقاضا کرتے ہیں۔ اپنے پیشہ وارانہ فرائض سے روگردانی قومی جرم

ہے۔ اس اعتبار سے تو خارجہ سیکرٹری کی تحسین کی جانی چاہیے تھی لیکن آپ انہیں فارغ کرنے جارہے ہیں۔ یہ بڑا ہی خطرناک کھیل ہے اور آپ اگر اس طرح ایسے سینئر بیوروکریٹس اور ذمہ دار افراد کو اختلاف رائے کی بنیاد پر ہٹائیں گے تو یہ آپ کی جانب سے اس بات کا اشارہ ہے کہ بیوروکریسی آپ کی تابع محمل بن کر رہے۔ یہ صورت حال ہو تو وہ پھر دستور کے مطابق اپنے فرائض ادا نہیں کر سکتی۔

میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مسئلہ کسی ایک فرد کا نہیں، ایک اصول اور پورے نظام کا ہے۔ اداروں کا تحفظ، قانون اور روایات کو پروان چڑھانا ہی ترقی کا راستہ ہے۔ میں بڑی دردمندی کے ساتھ یہ بات کہوں گا کہ اگر خبروں میں دی گئی باتیں صحیح ہیں تو وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کو اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ اختلاف رائے پر ہمدردی سے غور کرنا چاہیے اور اس کی بناء پر کسی کو سزا نہیں دینا چاہیے۔ اس پر مستزاد فراغت کا وہ طریقہ ہے جو اس باب میں اختیار کیا گیا۔ یہ اور بھی قابل مذمت ہے کہ ایک شخص جو دفتر سے اٹھ کر جارہا ہے، اس کو اپنی کار میں اطلاع ملتی ہے کہ اس کی فراغت کا نوٹیفکیشن کر دیا گیا ہے۔ اسی دن شام کو وزیر خارجہ کا عشائیہ تھا، چین کے وزیر خارجہ آئے ہوئے تھے، میں خود بھی اس میں شریک تھا اور مجھے تعجب ہوا کہ خارجہ سیکرٹری وہاں نہیں تھے لیکن مجھے صبح اخبارات سے پتا چلا کہ ان کے نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ اسی شام ان کو اس بھونڈے انداز میں فارغ کر دیا گیا تھا۔

جناب والا! میں کسی فرد کی بات نہیں کرتا، ایک اصول کی بات کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ یہ حکومت بھی افراد کے معاملات سے بالا ہو کر اصول کے معاملات میں ایک اچھی مثال قائم کرے گی۔ (۲۸۔ اپریل ۲۰۰۸ء)

امریکہ کا تزویراتی منصوبہ اور ہمارا ردعمل

جناب چیئرمین! میں حکومت کی توجہ کل کے اخبارات میں شائع ہوئی خبر کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ خبر کے مطابق امریکہ کے معاون وزیر خارجہ ڈیوڈ ٹی جانسن

(David T. Johnson) پاکستان تشریف لائے ہیں اور یہاں پر انہوں نے وزیر داخلہ سے ملاقات کی ہے۔ شائع ہونے والی خبروں کے مطابق امریکہ نے پاکستان سے سرکاری طور پر درخواست کی ہے کہ ہیلی کاپٹروں اور جہازوں کی مرمت اور اوورہالنگ کے لیے زمین کرایہ پر دی جائے اور پاکستان نے یقین دلایا ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے زمین مہیا کرے گا۔

اسی بیان میں امریکی اسسٹنٹ سیکرٹری نے ایک اور بات بھی کہی ہے۔ میں خاص طور پر آپ کی توجہ اس جانب دلانا چاہتا ہوں، کیونکہ ہمارے وزیر داخلہ بار بار انکار کر چکے ہیں کہ کوئی نجی سیکورٹی ایجنسی خواہ وہ Blackwater ہو یا Blackwater کی نئی صورت Xe یا کوئی اور ایجنسی، اس کا پاکستان میں کوئی وجود نہیں ہے۔ تاہم امریکی معاون وزیر خارجہ اسلام آباد کی سرزمین پر یہ بات کہتا ہے کہ:

> "امریکی سیکورٹی کمپنی ٹائن کارپوریشن ایک معاہدے کے تحت پاکستان میں کام کر رہی ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے"۔

غالباً امریکی سیکورٹی کمپنی کے حوالہ سے یہ معاہدہ جنرل مشرف کے زمانے میں ہوا تھا اور یہ بیان اسی کی بنیاد پر دیا گیا ہے۔ اس سے ایک ہفتہ پہلے امریکی سینیٹ کی کمیٹی میں ان کے ایک نمائندے نے گواہی دیتے ہوئے کہا ہے کہ "پاکستانی سرزمین پر ۲۰۰ امریکی فوجی موجود ہیں"۔

جناب والا! یہ ہماری خود مختاری کا بڑا اہم مسئلہ ہے لیکن بار بار غلط بیانی کرتے ہوئے حقیقت کا انکار کیا جاتا ہے۔ دوسری جانب امریکی ذرائع بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے کہتے ہیں کہ نہیں یہ ایک حقیقت ہے۔ میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ اس سے پہلے ایک آمر جنرل ایوب خان نے پشاور کے قریب امریکہ کو اڈا دیا تھا جس کی وجہ سے روس کے ساتھ پاکستان کے تعلقات میں خرابی بڑھی اور اس نے پاکستان کو دھمکی دی تھی کہ ہم براہ راست پشاور پر حملہ کر سکتے ہیں۔

مشرف صاحب نے ۶ ۔ اڈے امریکیوں کو دیے لیکن بعد میں کہا گیا کہ اب وہ ہٹا لیے گئے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک جانب امریکہ افغانستان سے اپنی فوجوں کی واپسی کی باتیں کر رہا ہے اور دوسری جانب پاکستان میں طویل عرصے کے لیے زمین کی لیز پر لے رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ طیارے اور ہیلی کاپٹر پاکستان میں کس لیے آئیں گے؟ یہ اڈے بنانے کا منصوبہ لگتا ہے۔ ہمیں غور کرنا چاہیے کہ آخر ہم کس طرف جا رہے ہیں؟

جناب والا! یہ بڑا سنجیدہ مسئلہ ہے، اس لیے میں چاہوں گا کہ وزیر خارجہ اور وزیر دفاع ایوان میں آئیں۔ تمام حقائق صحیح صحیح طور پر ایوان میں رکھیں اور ہمیں یہ بھی بتائیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ امریکہ کی طرف سے دعوے برابر کیے جا رہے ہیں اور آپ یا خاموش ہیں یا انکار کرتے ہیں۔ ڈرون حملوں کا معاملہ بھی یہی ہے کہ ڈرون حملے برابر ہو رہے ہیں، بڑھ رہے ہیں اور آپ محض خالی خولی کوئی بات کہہ دیتے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اب تو کئی بار اتنا بھی نہیں کیا جاتا۔ جبکہ پارلیمنٹ نے اپنی مشترکہ قرارداد میں واضح طور پر یہ کہا ہے کہ یہ حملے ہماری خود مختاری پر حملہ ہیں اور حکومت کو انہیں روکنے کے لیے ہر ممکن اقدام لینا چاہیے۔ لیکن ہم نہ صرف ان حملوں کو روک نہیں رہے ہیں بلکہ ہم جرم میں عملاً شرکت کر رہے ہیں یہ بڑا سنجیدہ معاملہ ہے۔ (۹ مارچ ۲۰۱۰ء)

پاک امریکہ فری ٹرانزٹ معاہدہ

جناب چیئرمین! سب سے پہلے تو میں آپ کی وساطت سے وزیر اعظم صاحب سے یہ درخواست کروں گا کہ آج جو موقع انہوں نے ہمیں دیا ہے، اس کا حق ادا کریں اور جو نکات اٹھائے جا رہے ہیں، انہیں ذرا توجہ سے سنیں اور نوٹ فرمائیں۔ دوسری جانب میں اپنے ساتھی سینیٹروں سے درخواست کروں گا کہ یہ روایت جو ہم نے قائم کر دی ہے کہ وزیر اعظم آتے ہیں تو سب (مختلف ذاتی مسائل کے لیے) ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں، یہ پارلیمانی آداب کے خلاف ہے۔

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ۱۸ویں ترمیم بلاشبہ پارلیمنٹ کا ایک اہم اقدام ہے۔ لیکن اسی ۱۸ویں ترمیم میں ایک بہت اہم پہلو یہ بھی ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وزیر اعظم اور کابینہ کو سینیٹ کے سامنے جوابدہ قرار دیا گیا ہے۔ تاہم میں دیکھ رہا ہوں کہ عملاً اس پر توجہ نہیں ہے۔ وزیر اعظم صاحب کو اب اس ایوان میں زیادہ وقت دینا چاہیے۔ ہم تھک گئے ہیں یہ شکایت کرتے کرتے کہ وزراء نہیں آتے۔ سوالوں کے موقع پر بھی متعلقہ وزراء موجود نہیں ہوتے۔ چیئرمین کی طرف سے انہیں توجہ دلائی جاتی ہے لیکن ان کے معمول میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آج بھی آپ کو معلوم ہے کہ وزراء کی عدم موجودگی کی بناء پر ایوان کو پندرہ منٹ کے لیے ملتوی کرنا پڑا۔ چنانچہ میں زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے اس ایوان کو وہ اہمیت دیجیے جس کا یہ مستحق ہے۔

جناب والا! قائد حزب اختلاف کے ٹھوس نکات کی تائید کرتے ہوئے میں صرف تین باتوں کی طرف وزیر اعظم صاحب کو متوجہ کروں گا۔ پہلی بات، حقیقت یہ ہے کہ جس محکومی اور شرمندگی سے پچھلے دس سال سے یہ قوم گزر رہی تھی اس کے برعکس ۲۶ نومبر[1] کے واقعے کے بعد جو مؤقف آپ نے لیا ہے، اس کے پیچھے پوری قوم ہے۔ یہ ایک سچائی کا مؤقف ہے، اس میں آپ کو ہمت دکھانے کی ضرورت ہے اور جو بھی دباؤ پڑے، اندرونی یا بیرونی، خدا کے لیے اس کے خلاف مزاحمت کیجیے۔ جب تک تعلقات کی نئی شرائط دو اور دو چار کی طرح سے طے نہیں ہو جاتیں، ان کو تحریر میں نہیں لایا جاتا اور واضح طور پر اصول مقرر نہیں ہو جاتے کہ کہاں تعاون ہو گا، کہاں تعاون نہیں ہو گا اور کیا چیز ہماری خود مختاری کی خلاف ورزی اور تجاوز سمجھی جائے گی، اس وقت تک کوئی تعاون نہیں ہونا چاہیے۔ جو مؤقف آپ نے لیا ہے، خواہ اس کا تعلق بین الاقوامی فورم پر جانے کا ہو یا راہداری کی سہولت فراہم نہ کرنے کا ہو، خدا کے لیے اس پر قائم رہیے، اس میں اگر آپ نے کوئی کمزوری دکھائی

---

[1] اشارہ ہے نیٹو افواج کی جانب سے پاک افغان بارڈر پر سلالہ کے قریب دو پاکستانی فوجی چوکیوں پر حملہ کی طرف۔ اس حملہ میں ۲۸ پاکستانی فوجی جاں بحق اور ۱۱ زخمی ہو گئے تھے۔

تو یہ ہمالیائی غلطی ہو گی۔

جناب والا! دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو سرخ لکیر آپ نے آج تک کھینچی تھی، وہ غلط مقام پر تھی۔ اس سرخ لکیر کو تین بنیادی چیزوں پر ہونا چاہیے: مملکت کی آزادی و خود مختاری، علاقائی سلامتی اور ملک کے اندر آپریشنز اور خفیہ سرگرمیاں، ان تینوں کی خلاف ورزی نا قابل برداشت اور نا قابل قبول ہے۔ اس کو واضح ہو جانا چاہیے اور اگر یہ خلاف ورزی ہوتی ہے تو پھر محض مذمت نہیں بلکہ مزاحمت کا راستہ بھی اختیار کرنا ہے۔

تیسری بات راہداری کی سہولت ہے۔ اگر تعلقات کی نئی شرائط طے کرنے کے بعد آپ یہ سہولت دیتے ہیں تو اس میں دو باتوں کا خیال رکھیے۔ پہلی بات یہ ہے کہ آنے والی رسد کی تلاشی کے بغیر کوئی چیز نہیں آئے گی۔ آپ کا اپنا محتسب یہ کہہ رہا ہے کہ ۳۶ ہزار ٹرک غائب ہوئے ہیں اور ان میں سے ۴ سے ۶ ہزار ایسے ہیں جن میں اسلحہ تھا۔ اگر وہ اسلحہ افغانستان نہیں گیا تو ظاہر اسے پاکستان میں اَن لوڈ کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ تلاشی کے بغیر کوئی اجازت نہ دیں۔ اس ضمن میں دوسری بات یہ ہے کہ مفت راہداری فراہم کرنا غلامی کی علامت ہے۔ واحد راستہ یہ ہے کہ آپ راہداری کے استعمال کے عوض سروس چارجز لیجیے اور معقول لیجیے۔ بلاشبہ انہیں مسابقتی ہونا چاہیے۔ آپ کے علم میں ہونا چاہیے کہ پاکستان کی راہداری کی سہولت کے مقابلے میں جو دوسرے ذرائع ہیں خواہ وہ فضائی ہوں یا وسطی ایشیا سے ہوں، ان کی لاگت پاکستان کی طرف سے عائد کردہ سروس چارجز سے چار سے دس گنا زیادہ ہے۔ آپ سروس چارجز ایسے متعین کیجیے کہ جس سے قرار واقعی ہمیں آمدنی ہو اور پھر خدا کے لیے نرمی سے کہہ دیجیے کہ ہمیں آپ کی معاشی امداد نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ یہ معاشی امداد ایک تباہ کن دھوکہ ہے، اس کے نتیجے کے طور پر ہم اقتصادی ایڈز میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ بمشکل پانچ یا چھ فی صد امداد ایسی ہے جو پاکستان کے فائدے کے لیے ہے، باقی ۹۵ فی صد ہمارے فائدے میں نہیں آ رہی۔ اس وقت ۸۰ فی صد امداد وہ اپنی این جی اوز کے ذریعے استعمال کر رہے ہیں جس سے عملاً ایک متبادل حکومت قائم ہو گئی ہے، اس صورت حال سے

نکلیے۔ سروس چارجز سے آپ کو اس سے تین گنا زیادہ آمدنی ہو سکتی ہے۔ تجارت کیجیے، تجارت کا راستہ کھولیے اور فوجی امداد کے بارے میں بھی صاف کہہ دیجیے کہ ہم اگر آپ سے کچھ خریدیں گے تو قیمت ادا کریں گے۔

ایک اور بات میں کہنا چاہوں گا کہ معیشت کی حالت بڑی خراب ہے۔ خود انحصاری ضروری ہے، خود انحصاری کے بغیر آپ آزاد خارجہ پالیسی نہیں چلا سکتے۔ خدا کے لیے اقتصادی پالیسی کے سلسلے میں سر جوڑ کر بیٹھیے، قومی اتفاق رائے پیدا کیجیے۔ ہمارے پاس وسائل ہیں، ہم ایک امیر ملک ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے وسائل کو صحیح استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ معیشت کو سنبھالے بغیر آپ کسی مؤقف پر کھڑے نہیں ہو سکیں گے۔

آخری بات یہ ہے کہ لاپتہ افراد کا مسئلہ بہت اہم ہے، انسانی حقوق کے نقطہ نظر سے، پاکستان کی سلامتی کے نقطہ نظر سے اور اسلامی اقدار کے نقطہ نظر سے۔ بلوچستان اور دوسرے صوبوں میں اس کی وجہ سے جو نفرت پیدا ہو رہی ہے، وہ عدم سلامتی کا سبب بن رہی ہے۔ بدقسمتی سے اب تو بلوچستان میں افراد صرف لاپتہ نہیں ہو رہے بلکہ ہر دوسرے دن ان لاپتہ افراد کی لاشیں آ رہی ہیں۔ جناب والا! یہ بڑا سنجیدہ مسئلہ ہے، اسے اہمیت دیجیے۔

یہ تین نکات تھے جن کی طرف میں اس وقت خصوصیت سے متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ (۱۴ دسمبر ۲۰۱۱ء)

قائد حزب اختلاف پر القاعدہ سے تعلق کا الزام

جناب چیئرمین! سینیٹر مولانا گل نصیب صاحب نے ایک بڑے ہی اہم مسئلے کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے۔ میں اس کے ایک اور رخ کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ امریکہ کی جانب سے ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں سب سے بڑا معاون و مددگار پاکستان ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ خود امریکہ جتنا کچھ شکار نہیں کر سکا ہے پاکستان نے وہ کچھ کر کے اس کو دیا ہے۔ درحقیقت

پناہ گزینی کے کسی قانون اور عدالت سے رجوع کیے بغیر یہ سارا کام ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جس طرح پاکستان ہی کو ٹارگٹ بنایا جا رہا ہے یہ ایک بڑی سوچی سمجھی مہم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری وزارت خارجہ، ملک کے ذمہ دار افراد اور ہمارے سفارت خانے کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ موجودہ صورت حال میں ہم کیا قانونی اور سیاسی اقدام لے سکتے ہیں۔

صورت حال یہ ہے کہ جب پاکستان کا کوئی اہم شخص باہر جاتا ہے، صدر ہو یا وزیر اعظم اور یا کوئی اور اہم پیشرفت ملک میں ہوتی ہے اس وقت پاکستان کے خلاف کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑا جاتا ہے۔ اس وقت زیر بحث معاملے میں تو حد ہی کی گئی ہے کہ قائد حزب اختلاف مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا نام لے کر ان پر القاعدہ کی مدد کا الزام لگا دیا گیا ہے۔ حالانکہ فضل الرحمٰن صاحب کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ القاعدہ کا کوئی کیمپ پاکستان میں کبھی قائم نہیں ہوا، کبھی تھا تو افغانستان میں تھا، پاکستان میں نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ القاعدہ کے لوگ پاکستان آئے ہوں اور یہاں پناہ لی ہو، ان کو آپ نے پکڑا بھی ہے۔ لیکن اس کو کیمپ کہنا اور پھر اس میں قائد حزب اختلاف کا نام استعمال کرنا ساری دنیا میں اس کو براڈکاسٹ کرنا اور پھر اس کے اوپر تبصرہ ہونا سوچی سمجھی اسکیم کا حصہ نظر آتا ہے۔ اگر بعد میں اس کی تردید آ بھی جاتی ہے تو جو خرابی پیدا کی جا چکی ہے اس کا مداوا نہیں ہوتا۔

جناب والا! آپ خود بڑے ماہر قانون دان ہیں۔ یہ سوچیں کہ کس طرح ہم اپنی اور اپنے ملک اور اہم شخصیات کی عزت کو محفوظ کر سکتے ہیں۔ ہمارا بازو مروڑ کر اور بلیک میل کر کے وہ ہم سے من مانی کروانا چاہتے ہیں اور پاکستان پر دباؤ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ جھوٹ جو پھیلایا جا رہا ہے، یہ بلاجواز اور بے سبب نہیں ہے۔ یہ مخصوص پالیسی کا حصہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی طرف توجہ دی جائے اور حکومت بجائے اس کے کہ امریکہ کے مطالبات کی جائز و ناجائز پیروی کرے، اپنے دفاع کے لیے، اپنے ملک کے دفاع کے لیے اور اپنے نام کے دفاع کے لیے مؤثر اقدام کرے۔ یہ پہلو بھی قابل غور ہے۔

جناب چیئرمین! میں اس موقع پر امریکہ کے پڑوسی ملک میکسیکو کی مثال آپ کے

سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ حال ہی میں جب امریکہ نے یہ پابندی لگائی کہ جو بھی اس کے ملک میں داخل ہو گا اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی انگلیوں کے نشانات لیے جائیں تو میکسیکو نے علی الاعلان یہ مؤقف اختیار کیا کہ اگر آپ میکسیکو کے شہریوں پر یہ پابندی لگائیں گے تو جو امریکی میکسیکو میں داخل ہو گا اس کو بھی یہی کرنا پڑے گا۔ آپ کا بھی یہی موقف اور پالیسی ہونی چاہیے کہ جو پابندیاں ہمارے لیے وہاں پر لگائی گئی ہیں وہی ہمارے یہاں آنے والے امریکیوں پر ہوں گی۔ اس کے بعد جو امریکی پاکستان آئے گا خواہ وہ کونڈولیزا رائس ہو یا کوئی اور اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جائے گا۔

(۵جون ۲۰۰۵ء)

غیر سفارتی اور غیر قانونی امریکی اقدامات پر رد عمل

دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کے ساتھ تعاون کے حوالہ سے جنرل مشرف کی طے کردہ پالیسی کے ابہام نے حکومت پاکستان کے لیے بہت سی کمزوریاں اور مشکلات پیدا کیں۔ دوسری جانب امریکہ کے ساتھ تعاون کی پالیسی کو داخلی سطح پر عوامی حمایت حاصل نہ تھی۔ نتیجتاً حکومت پاکستان کی امریکہ کے ساتھ معاملات کرنے کی قوت اور بھی زیادہ متاثر ہوئی۔ امریکہ نے ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اہداف کے حصول کے لیے ایسے اقدامات کیے جن میں بین الاقوامی قوانین اور سفارتی آداب تک کو نظر انداز کیا گیا۔ زیر نظر باب میں ایسے ہی کچھ واقعات پر مختلف اوقات میں سینیٹ میں کی گئی تقاریر کو مرتب کر کے پیش کیا گیا ہے۔

مسلم این جی اوز کو دہشت گرد قرار دینے کا معاملہ

جناب والا! سب سے پہلے تو میں ایوان کے دونوں طرفین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ڈاکٹر عبد القدیر خان کے بارے میں میری جانب سے اٹھائے گئے مسئلے اور اس سلسلہ میں دی گئی تجویز کی تائید کی ہے کہ اس ہاؤس کا ایک وفد ان سے جا کر ملے اور اسے ہم سرکاری طور پر اٹھائیں۔ میں خاص طور پر اپنی بہن فوزیہ فخر زمان صاحبہ کا ممنون ہوں کہ انہوں نے بڑی ہی دل سوزی کے ساتھ مجھے ٹیلیفون کیا اور یہ کہا کہ میں خود بھی اس وفد میں جانا چاہتی ہوں۔ در حقیقت یہ مسئلہ کسی فرد کا نہیں ہے، یہ پوری قوم کا مسئلہ ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ ڈاکٹر عبد القدیر خان کے معاملے کو کسی بھی حیثیت میں پارٹی کا مسئلہ بنایا جائے۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس تجویز پر آپ مشورہ کر کے جلد کوئی نہ کوئی

اقدام کریں۔

دوسری بات جو میں آج اٹھانا چاہتا ہوں، وہ امریکہ کی جانب سے دو این جی اوز کو دہشت گرد قرار دینے سے متعلق ہے۔ آپ کے علم میں یہ بات ہو گی کہ امریکہ نہ صرف ہمارے معاملات میں مداخلت کر رہا ہے بلکہ خصوصیت سے ان تمام تنظیموں کو ہدف بنا رہا ہے جو اسلامی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ خواہ یہ خدمات تعلیم کے میدان میں ہیں یا دعوت اور فلاحی سرگرمیوں کے میدان میں ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بڑی ہی تکلیف دہ اور تشویشناک خبر یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کی دو جماعتوں کو سرکاری طور پر دہشت گرد قرار دیا ہے۔ ان میں ایک جماعت الدعوۃ ہے اور دوسرا ادارہ خدمت خلق ہے۔

امریکہ کے اس فیصلہ پر غور کیا جائے تو درحقیقت اس کی حالت پر سر پیٹنے کو دل چاہتا ہے۔ اس وقت وہ دنیا کی واحد سپر پاور ہے۔ دنیا میں اس کی سب سے بڑی ایمبیسی یہاں اسلام آباد میں ہے اور ایمبیسی کے باہر بھی ان کے ذرائع معلومات کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن ان کے اعلان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو یہ تک معلوم نہیں ہے کہ ادارہ خدمت خلق کوئی الگ تنظیم نہیں ہے بلکہ جماعت الدعوۃ ہی کے ایک شعبے کا نام ہے۔ جماعت الدعوۃ میں تعلیم کا کام بھی ہوتا ہے اور دعوت اور خدمت کا کام بھی ہوتا ہے۔ یوں ادارہ خدمت خلق، جماعت الدعوۃ ہی کا ایک شعبہ ہے لیکن انہوں نے اسے دو تنظیمیں قرار دے کر پابندی لگائی ہے۔

پھر جناب والا! جماعت الدعوۃ کوئی آج قائم نہیں ہوئی ہے۔ ۱۹۸۵ء سے یہ تنظیم کام کر رہی ہے۔ خدمت کے میدان میں اس کا بڑا اچھا ریکارڈ ہے۔ اس کا کسی ایسی سرگرمی سے تعلق نہیں جو قانون کی زد میں آتی ہو۔ خاص طور پر ۲۰۰۵ء میں زلزلہ کے موقع پر پوری قوم نے ہی نہیں پوری دنیا نے دیکھا کہ کس طرح دیگر اسلامی تنظیموں کے ساتھ جماعت الدعوۃ نے بے لوثی اور خطرہ مول لے کر کام کیا ہے۔ حکومت کے جو ذمہ داران یہاں موجود ہیں، انہیں علم ہے کہ گزشتہ سال (۲۰۰۵ء میں) کس طرح زلزلہ کے تین گھنٹے کے اندر اندر جماعت الدعوۃ اور الخدمت کے تمام کے تمام کارکن موقع پر موجود تھے اور عام شہریوں کے

ساتھ ساتھ جو ہمارے فوجی بھائی زلزلہ سے متاثر ہوئے تھے، انہوں نے ان کی نعشیں نکالنے کا کام بھی انجام دیا ہے۔ ان اداروں کے کام کا تمام مقامی اور بین الاقوامی این جی اوز نے خیر مقدم کیا ہے۔ میرے علم میں ہے کہ روٹری کلب نے بھی [جس کی کوئی اسلامی شناخت نہیں ہے] ان اداروں کے کام کی نہ صرف تعریف کی بلکہ ان کے ذریعے کام لیا۔ روٹری کے صدر نے مجھے خود بتایا ہے کہ وہ مشکل ترین مقامات جہاں ان کے لوگ خیمے نہیں پہنچا سکتے تھے اور روٹری نے ان کے لیے بنے بنائے مکان تعمیر کرنے کا پروگرام بنایا تھا وہ جب ان سے نہ ہو سکا تو انہوں نے ان خدمتی تنظیموں سے رابطہ کیا جنہوں نے نہایت بے لوثی کے ساتھ یہ کام سرانجام دیا۔

جناب والا! یہ امریکہ کا تکبر ہے اور غلط کاری ہے کہ وہ اس قسم کے اداروں کو بھی دہشت گرد قرار دے کر پابندی لگوا رہا ہے۔ تاہم امریکہ کے اقدام کے مقابلہ میں ہمارا اپنا رد عمل میرے خیال میں زیادہ تشویشناک ہے۔ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جب دفتر خارجہ کے ترجمان سے امریکی اقدام کے بارے میں سوال کیا گیا تو ان کی جانب سے کوئی مؤثر جواب دینے کی بجائے کہا گیا کہ امریکہ کا کوئی بھی اعلان ہمارے لیے خود بخود لاگو نہیں ہو جاتا۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے اعلانات کی بات بہر حال مختلف ہوتی۔ قانونی طور پر ان کی بات صحیح ہے لیکن میری نگاہ میں امریکہ کی اس قسم کی منہ زوریوں پر مؤثر اور بھرپور احتجاج ہونا چاہیے۔ ہم کب تک اس طرح منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہیں گے، کب تک ہمارے اداروں کو اس طرح بدنام کیا جائے گا اور ہدف بنایا جائے گا؟

درحقیقت یہ صرف اداروں کی ہی نہیں بلکہ ملک کی اور ہم سب کی بھی بے عزتی ہے۔ اس لیے جناب والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہم میں کم از کم اتنی غیرت تو ہونی چاہیے جس کا مظاہرہ لبنان نے کیا ہے۔ جب امریکہ نے حزب اللہ کے بارے میں کہا کہ وہ دہشت گرد تنظیم ہے تو ان کے صدر نے صاف کہا کہ اپنی زبان کو لگام دو، یہ ہماری پارلیمانی پارٹی ہے اور ہماری حکومت کا حصہ ہے اور آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ ہمارے معاملات میں

اس طرح مداخلت کریں۔

جناب والا! میں زور دے کر کہوں گا کہ یہ گورنمنٹ اور اپوزیشن کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ پوری قوم کی عزت کا مسئلہ ہے۔ اسلامی خدمتی اداروں کو دہشت گرد قرار دینا اور پھر ان کی خدمات سے مجبور انسانوں کو محروم کرنے کی یہ ایک گھناؤنی سازش ہے۔ ہمیں اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ میں دعوت دوں گا حکومتی پارٹی کو اور خصوصاً قائد ایوان کو جو کہ اس وقت ہاؤس میں نہیں ہیں اور وزیر پارلیمانی امور کو بھی، اگرچہ وہ بھی موجود نہیں ہیں کہ اس مسئلہ پر ہم ایک پارلیمانی معاملے کی حیثیت سے غور کریں۔ اس لیے میں تجویز پیش کروں گا کہ سینیٹ اس پر کھل کر مذمت کا اظہار کرے اور یہ کہے کہ امریکہ کو اپنی حدود میں رہنا چاہیے۔ ہم ایک خود مختار ملک ہیں، ہم ایک اسلامی ملک ہیں اور ہمارے جو بھی ادارے اسلامی بنیادوں پر خدمت کا کام کر رہے ہیں، ان کی پشت پناہی اور ان کی حمایت اس قوم کا کام ہے۔

اس ملک کا اپنا قانون موجود ہے، اگر کسی نے خلاف ورزی کی ہے تو ہمیں اس کے تحت اقدامات کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن امریکہ کو ہمارے معاملات میں مداخلت کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں ہماری جانب سے بہت ہی واضح پیغام جانا چاہیے۔

مجھے خوشی ہے کہ قائد ایوان وسیم سجاد صاحب آگئے ہیں۔ میں اپنی بات دہرا رہا ہوں کہ ہماری جانب سے واضح پیغام جانا چاہیے کہ فلاحی سرگرمیوں اور خدمت کے میدان میں جماعت الدعوۃ اس ملک کا ایک قیمتی ادارہ ہے۔ اس کی خدمات قابل قدر ہیں، جن کا پوری قوم نے ہی نہیں، پوری دنیا نے اعتراف کیا ہے۔ اس کے بارے میں امریکہ کا رویہ نہ صرف ہمارے لیے ناقابل قبول ہے بلکہ ہم اس کی کھل کر مذمت کرتے ہیں۔ اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ امریکہ کو ہمارے معاملات میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے تاکہ یہ چیز ایک نظیر بنے اور آئندہ کوئی بھی ہمارے اندرونی معاملات میں اس طرح سے مداخلت نہ کرے۔ (۱۵ مئی ۲۰۰۶ء)

لاپتہ افراد اور گوانتاناموبے

میں سب سے پہلے اپنے تمام بھائیوں اور بہنوں کی اس بات کی تائید کرتا ہوں کہ لاپتہ افراد کا مسئلہ ایک بڑا سنجیدہ مسئلہ ہے۔ اس وقت ایک دو نہیں کئی سو بلکہ کچھ رپورٹوں کے مطابق پورے ملک میں ۳۰۰۰ سے زیادہ افراد لاپتہ ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ سارے احتجاج کے باوجود حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔ ہماری سینیٹ کی انسانی حقوق کمیٹی بھی بے بس ہے، میں نے کئی دفعہ میٹنگز بلوائی ہیں، ذمہ داران وہاں پر آتے ہیں لیکن ہمیں کوئی بات نہیں بتاتے۔ بلاشبہ ان لاپتہ افراد میں سے ہر ہر فرد کا معاملہ بڑا سنجیدہ اور سنگین ہے۔ میں ساتھ ہی یہ اضافہ بھی کرنا چاہوں گا کہ اس وقت گوانتاناموبے میں سات پاکستانی بشمول سیف اللہ پراچہ سخت اذیت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ وہاں پر پانچ، چھ سالوں سے سڑ رہے ہیں۔ نہ ان پر کوئی مقدمہ چلایا جاتا ہے اور نہ ہی پاکستانی حکومت کوئی اور کردار ادا کر رہی ہے۔

اس وقت انگلستان کا ایک وکیل Zakery Crest Wilson پاکستان آیا ہوا ہے۔ میری اس سے آج ہی ملاقات ہوئی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ پہلے گوانتاناموبے میں ایک ہزار سے زیادہ افراد تھے جن میں سے کم ہو کر اب ۲۷۰ رہ گئے ہیں کیونکہ جن جن ممالک کی حکومتوں نے دلچسپی لی ہے اور اپنے اختیارات استعمال کیے ہیں، وہ اپنے لوگوں کو واپس لے جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ لیکن پاکستانی حکومت اس معاملے میں خواب خرگوش میں مبتلا ہے۔ یہ ایک ایسا سنجیدہ مسئلہ ہے کہ اس پر فوری طور پر کارروائی کرنے کی ضرورت ہے۔

(۴جون ۲۰۰۸ء)

پاکستان میں امریکی فوجی اتارنے کی دھمکی

جناب چیئرمین! میں آپ کا اور قائد ایوان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس بات کی قدر کرتا ہوں کہ وزیر خارجہ نے خاصا وقت ایوان میں گزارا ہے۔ اسی طرح دوسرے وزراء کی

شرکت بھی قابل قدر ہے۔ جناب چیئرمین! میرے دونوں پوائنٹس آف آرڈر کا تعلق کیونکہ خارجہ پالیسی اور وزیر خارجہ سے ہے، اس لیے میں ان کو ایک ساتھ پیش کر دیتا ہوں۔

سب سے پہلی بات آج کے نوائے وقت میں اور بین الاقوامی میڈیا پر آنے والی افسوسناک خبر سے متعلق ہے۔ خبر کی سرخی ہے، اُسامہ کے تعاقب میں بغیر اجازت پاکستانی علاقے میں فوج اتاریں گے۔ تفصیل میں بتایا گیا: امریکی ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے امریکی نائب وزیر خارجہ جارج نیگرو پونٹے نے کہا کہ اُسامہ بن لادن کا جہاں تک تعلق ہے، اگر پاکستان کے سرحدی علاقوں میں اس کی کہیں بھی موجودگی کا کوئی ناقابل تردید ثبوت ملا تو پاکستان سے کسی قسم کی اجازت لیے بغیر سرحدی علاقوں میں فوج اتار دیں گے اور القاعدہ کے رہنما کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔

جناب والا! یہ محض کوئی آج کا بیان نہیں ہے یہ امریکہ کا مسلسل عمل ہے۔ میں آپ کی توجہ اس پر دلاؤں کہ امریکہ، اس وقت تک ۳۷ مرتبہ پاکستان کی سرحدوں کی خلاف ورزی کر چکا ہے، کبھی صرف معائنے کے نام پر اور کبھی جاسوسی کے لیے اور متعدد بار بمباری کے لیے۔ بمباری کے نتیجے میں گزشتہ دو سالوں میں ڈھائی سو کے قریب لوگ شہید اور مزید سینکڑوں زخمی ہو چکے ہیں۔ دوسری جانب تین مارچ کو New York Times نے بڑی تفصیلی رپورٹ دی جس میں یہ بتایا گیا کہ ایک سو امریکی ٹرینرز پاکستان میں ہیں۔ ٹریننگ کے لیے آنے والے یہ لوگ زندگی کے مختلف دائروں میں مداخلت کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ واشنگٹن پوسٹ کی یہ رپورٹ بھی قابل ذکر ہے جناب والا! کہ چھ امریکی اڈے پاکستان میں کام کر رہے (Operational) ہیں، جہاں امریکی انٹیلی جنس اور دیگر افسران انٹیلی جنس کے آپریشنز کو مربوط کرنے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ پھر جناب والا! میرے پاس ۱۷ اپریل کے اخبارات کا حوالہ موجود ہے جس میں کہا گیا ہے:

> امریکہ نے افغانستان کے راستے پاکستان میں داخلے کے لیے براہ راست رسائی طلب کی ہے۔ اس مقصد کے لیے اسلام آباد میں امریکی سفارت خانہ میں ایک

افسر متعین کیا گیا ہے۔

اسی طرح امریکی نائب وزیر خارجہ رچرڈ باؤچر نے اسی زمانے میں یہ بات کہی ہے کہ دہشت گردی کے خلاف امریکہ پاکستان میں اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکا ہے اور یوں ہم کوئی وعدہ پاکستان سے نہیں کر سکتے۔ چنانچہ پاکستان کی اجازت کے بغیر اگر کسی کو [دہشت گردی کا] مضبوط ٹھکانہ سمجھیں گے تو اس پر بمباری کریں گے۔ جناب والا! یہ ساری باتیں ایک پورے منظم طریقے سے سامنے آ رہی ہیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ پچھلے سات ساڑھے سات سال میں دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کے لیے جس طرح ہم نے تعاون کیا ہے، اس کے نتیجے کے طور پر ہماری خود مختاری، ہماری آزادی، ہماری سرحدیں، ہمارے علاقے، ہمارے مدارس اور ہماری بستیاں اور ہمارے گھر کچھ بھی محفوظ نہیں رہا ہے۔

دنیا بھر کا قاعدہ ہے کہ کسی بھی معاملے میں تعاون کے کچھ اصول، ضابطے اور کچھ حدود ہوتی ہیں۔ تاہم یہاں کوئی حد نہیں ہے۔ امریکہ جب چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے، وہ مسلسل کرتا چلا جا رہا ہے۔ جناب والا! ہمیں واضح کرنا چاہیے کہ پاکستان کے عوام اب ان دراندازیوں کو گوارا کرنے کو تیار نہیں۔ درحقیقت ۱۸ فروری کے قومی انتخابات میں اس قوم نے سرینڈر کی اس پالیسی کو یکسر رد کر دیا ہے۔ ہماری عزت، آزادی اور آبرو خطرے میں ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کی موجودہ حکومت صاف لفظوں میں یہ بات کہہ دے کہ کسی دوسرے کی دہشت گردی کی جنگ کے لیے آلہ کار بننا ہمیں قبول نہیں۔ یہ قوم اپنی عزت اور آزادی کو اس طرح قربان کرنے کو تیار نہیں ہے۔

میں یہ بات بھی بڑے ادب سے کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ بڑی طاقت ضرور ہے لیکن بڑی طاقت کے معنی یہ نہیں کہ وہ دنیا کے جس خطے اور جس ملک کو چاہیں، نشانہ بنائیں اور اس کی خود مختاری کو پامال کریں۔ کیوبا امریکہ کے پڑوس میں واقع ایک چھوٹا سا ملک ہے لیکن آپ دیکھیے کس طرح ۶۰ سال سے کیوبا نے امریکہ کی مزاحمت کی ہے، اور اپنی عزت اور خود مختاری کا دفاع کیا ہے۔ اسی طرح لبنان بھی ایک چھوٹا سا ملک ہے لیکن آپ دیکھیے کہ

کس طرح اس نے امریکہ اور اسرائیل کو سبق سکھایا ہے۔ کیا پاکستان میں اتنی بھی صلاحیت نہیں ہے ؟ کیا ہم اتنے گئے گزرے ہیں کہ امریکہ جب چاہے اور جس طرح چاہے ہماری زمین پر کشت وخون کرے ؟

جناب والا! میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ اب ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے کہ امریکہ کو یہ وارننگ دی جائے کہ پاکستان کی سرحدوں کی خلاف ورزی کو اقدام جنگ تصور کیا جائے گا اور پاکستان کی فوجیں اس کا مقابلہ کریں گی۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان کی پوری قوم اس کا مقابلہ کرے گی اور یہی وہ راستہ ہے جس سے آپ اپنی عزت اور اپنی آزادی کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ہم کسی سے لڑائی نہیں چاہتے، ہم امریکہ سے تعاون کرنا چاہتے ہیں لیکن امریکہ نے ہمارے اس تعاون کا غلط اور ناجائز استعمال کیا ہے، اور ہماری جانب سے مزاحمت نہ ہونے کو امریکہ نے ہماری کمزوری قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری سابقہ قیادت [جنرل مشرف] نے ملک کے مفاد کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ہمیں واضح کر دینا چاہیے کہ اب یہ رویہ قابل برداشت نہیں رہا۔ اس لیے جناب والا! میں پوری قوت کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت، وزیر اعظم اور دفتر خارجہ کو قوم کی امنگوں اور عزائم کی روشنی میں امریکہ سے تعلقات اور تعاون کے بارے میں ایک نیا اقدام لینا چاہیے۔ براہ مہربانی پارلیمنٹ کو اعتماد میں لیجیے اور پالیسی دوبارہ بنائیے، یہی وہ طریقہ ہے جس سے آپ اپنے حقوق کی حفاظت کر سکیں گے۔ (۲۸۔ اپریل ۲۰۰۸ء)

پاکستانی مسافروں کی امریکہ میں خصوصی چیکنگ

جناب چیئرمین! میں اپنے عزیز بھائی میاں رضا ربانی اور جان محمد جمالی صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے پاکستانی مسافروں کی امریکہ میں خصوصی چیکنگ کے مسئلے کا بروقت نوٹس لیا ہے۔ وقت بہت محدود ہے، اس لیے تفصیل میں جائے بغیر اپنی بات نکات کی شکل میں آپ کے سامنے رکھوں گا۔

جناب چیئرمین! پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے ساتھ امریکہ کا رویہ معاندانہ، مخاصمانہ اور حقارت آمیز ہے۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ جنرل مشرف نے اپنے دور صدارت میں کیا کیا۔ ظاہر ہے انہوں نے بہت غلط کیا لیکن جو کچھ ہو گیا، وہ ہو چکا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی آزادی، خود مختاری، حاکمیت اور عزت کی حفاظت ایک آزاد قوم کی حیثیت سے کریں۔ اس ہدف کے حصول میں سب سے بڑا خطرہ امریکہ ہے۔ میں یہ بات اپنی ذاتی رائے کی بناء پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ Pew International نے پاکستانی رائے عامہ کے جو سروے حال ہی میں کیے ہیں ان کے مطابق پاکستان کے لوگوں نے اپنے لیے پہلا خطرہ امریکہ کی مداخلت کو قرار دیا ہے۔ اس کے بعد معاشی مسائل آتے ہیں۔ جبکہ دہشت گردی کو بہت ہی کم لوگ پہلا خطرہ قرار دیتے ہیں۔ اس تناظر میں ہمیں اپنی ترجیحات کو بدلنا ہو گا اور جو حقیقی خطرہ ہے، اس کو محسوس کرنا ہو گا۔ آج خطرہ ہماری آزادی کو ہے اور اس کا دفاع ہماری ذمہ داری ہے۔

جناب والا! اسی ضمن میں ڈرون حملوں کی بحث کے دوران بھی اور اس کے علاوہ بھی ہم نے ہر سطح پر اپنے اعتراض کا اظہار کیا ہے کہ حکومت کی کمزوری اور خاموشی یا تعاون نے پاکستان کے وقار، عزت اور خود مختاری کو سخت مجروح کیا ہے۔ دراصل اسی خاموشی اور کمزوری کا تسلسل ہے کہ اب حد یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وہ اپنے ایئرپورٹس پر پاکستانیوں کی برہنہ تلاشی کر رہے ہیں۔ امریکی قانون کے تحت جن ۱۴ ممالک کو برہنہ تلاشی کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے، وہ سارے مسلم ممالک ہیں، دوسرے الفاظ میں انہوں نے یہ پیغام دیا ہے کہ ہمارے لیے ان کا یہ معیار ہے۔ میری نگاہ میں اگر ہم نے اب بھی 'جیسے کو تیسا' کے اصول پر اور برابری کی بنیاد پر کام نہ کیا تو پھر ہم ایک نئی غلامی کی طرف جا رہے ہیں اور آزادی سے ہاتھ دھو رہے ہیں۔

جناب والا! میں اس مرحلہ پر آپ کو دو بڑے اہم حوالے پیش کرنا چاہتا ہوں: میرے پاس یورپی عدالت کا فیصلہ ہے اور یہ فیصلہ ابھی پچھلے ہفتے ہی آیا ہے۔ اس فیصلہ میں انہوں

نے یہ بات صاف الفاظ میں کہی ہے کہ بغیر کسی شبہ کے لوگوں کی تلاشی غیر قانونی ہے۔ انہوں نے یہ بات کہی ہے کہ مداخلت بے جا انسان کے بنیادی حق کی خلاف ورزی ہے اور جسم ٹٹول کر تلاشی لینا شخصی تخلیہ میں مداخلت ہے۔ ہم سے بنیادی حقوق کی بات کی جاتی ہے اور مغرب بنیادی حقوق کا علمبردار ہونے کا فخریہ بیان کرتا ہے۔ درحقیقت ہمارے ساتھ جو رویہ اختیار کیا جارہا ہے، وہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور بے عزتی اور تحقیر کا اظہار ہے۔ اسی طرح ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ کل آئی ہے۔ میں نے CNN اور BBC دونوں پر اس کی کچھ تفصیلات سنی ہیں۔ ایمنسٹی نے یہ بات صاف طور پر کہی ہے کہ یہ اقدام انسانی حقوق اور انسانی وقار کی خلاف ورزی ہے، اس کے لیے لازمی ہے کہ عالمگیر احتجاج کیا جائے اور امریکہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے رویے کو بدلے۔ ایک اور چیز جو اس میں آرہی ہے، وہ امتیازی سلوک کا معاملہ ہے، اور انسانی حقوق اور خود مختاری کی خلاف ورزی اور نجی معاملات میں مداخلت بے جا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ 'تخریب شخصیت' ہے، آپ تخریب شخصیت کے ذریعے تمام مسلم ممالک کے لوگوں بشمول پاکستانیوں کو ہدف بنارہے ہیں، دوسروں سے آپ ان کو ممیز کررہے ہیں۔ دہشت گرد امریکی ہو، پاکستانی ہو اور یا بھارتی، وہ دہشت گرد ہے۔ لیکن ہمیں ایک قطار میں رکھنا اور باقیوں کو مستثنیٰ کردینا، یہ شدید امتیازی سلوک ہے اور اس بارے میں یورپ کی انسانی حقوق کی عدالت (Strasbourg Court) کا فیصلہ موجود ہے جس میں انہوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہے کہ جس پر شبہ ہو، آپ اس کو جانچ پڑتال نہ کریں لیکن بطور امتیازی سلوک مناسب دلیل یا شبہ کے بغیر ہر ایک کی جامہ تلاشی انسانی تفریق ہے۔

جناب چیئرمین! میں ساتھ ہی یہ بھی کہوں گا کہ آج تک کے سارے اقدامات عملاً ناکام رہے ہیں۔ ۹/۱۱ کے موقع پر جو کچھ ہوا، بعینہ وہی حال ہی میں Detroit کے جہاز کے واقعہ میں ہوا[1] جناب والا! مجھے اجازت دیں کہ میں اس حوالہ سے 'Independent

[1] ۲۵ دسمبر ۲۰۰۹ء کو ہونے والے اس واقعہ میں نارتھ ویسٹ ایئرلائن کی ایک پرواز میں ایک نائیجیرین مسافر کے پاس سے دھماکہ خیز کیمیائی مادہ برآمد ہوا تھا۔

'London کا اداریہ پڑھ کر سناؤں جس میں انہوں نے صاف کہا ہے کہ:

۹/۱۱ اور مستقبل میں جسے امریکی ممکنہ طور پر ۱۲/۲۵ کہیں گے کے درمیان جو مماثلت ہے وہ مایوس کن ہے۔ ایک بار پھر کافی شواہد موجود تھے ایک بار پھر سرکاری سیکورٹی ایجنسیاں سنجیدگی سے، جیسا کہ واقعہ کا تقاضا تھا، شواہد پیش کرنے میں ناکام رہیں اور ایک بار پھر یہ ایجنسیاں حاصل شدہ معلومات کو اکٹھا کرنے میں ناکام ہو گئیں جیسا کہ پیشہ ور ذمہ داران کو کرنا چاہیے کہ نقطوں کو جوڑیں [اور مکمل تصویر بنائیں]۔ اس واقعہ میں تو نقطوں کا سائز فٹ بال کے برابر تھا۔ اس واقعہ سے ایک ہفتہ قبل لڑکے کے والد کی جانب سے بیٹے کے چال چلن کے بارے میں امریکی سی آئی اے کو متنبہ کیا گیا تھا مزید یہ کہ چیٹر (Chatter) نے یمن میں چھپے ہوئے ایک نائیجیرین کے بارے میں کچھ گفتگو پکڑی تھی۔

صاف معلوم ہوا کہ تلاشیاں لینے کی یہ پالیسی ناکام رہی۔ پھر اس فیصلہ کی کیا وجہ ہے؟ درحقیقت اس کی وجہ صرف ہراساں اور تذلیل کرنا ہے اور جس کا تجربہ ہمارے اراکین پارلیمنٹ نے امریکی سفارت کار رچرڈ ہالبروک کے سامنے اسلام آباد میں کیا ہے۔ مجھے بھی اس موقع پر بلایا گیا تھا لیکن میں نے صاف انکار کر دیا کہ کسی کو ملنا ہے تو میرے دفتر میں آئے، میں حاضر ہوں لیکن اس طرح آپ کے پاس حاضری نہیں دوں گا۔ جناب والا! اگر ہم خود اپنی عزت کی حفاظت نہیں کرتے ہیں تو پھر کوئی اس کی حفاظت نہیں کرے گا، اس لیے میں اقبال کے ایک شعر کے ساتھ بات کو ختم کرتا ہوں کہ: ؎

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

اب مسئلہ تن کا بھی ہے اور من کا بھی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہمارا ایوان واضح کر کے یہ بات کہے کہ بس بہت ہو گیا ہم تم سے مزید تعاون کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔

تمہیں اپنی پالیسیوں کو بدلنا ہو گا اور اگر نہیں بدلو گے تو پاکستانی قوم، پاکستانی حکومت اور پاکستانی پارلیمنٹ تمہارے ساتھ وہی سلوک کرے گی جو تم ہمارے ساتھ کر رہے ہو۔ ہمیں ان سے پیسے نہیں چاہئیں، ۵ء۱ بلین ڈالر میں سے اب تک صرف ۳۰۰ ملین کے قریب ملے ہیں لیکن اس وقت تک اس قوم کو جو نقصان ہوا ہے جناب والا! وہ ۴۵ بلین ڈالر سے زیادہ ہو چکا ہے۔ دوسری جانب ہماری معیشت بھی امریکہ کے تعاون کی بناء پر تباہ ہو رہی ہے، اس یکطرفہ اور توہین آمیز تعاون کو ختم کیجیے، اپنی عزت اور آزادی کی حفاظت کیجیے، یہی واحد راستہ ہے۔ (۱۹ جنوری ۲۰۱۰ء)

امریکی ایئرپورٹس پر برہنہ تلاشی کا معاملہ

کیا وزیر امور خارجہ بتانا پسند کریں گے کہ بہت سے ممالک [جن میں مسلم ممالک بھی شامل ہیں] کے امریکہ جانے والے مسافروں کی جامہ تلاشی کے بارے میں جو نئے قواعد لاگو کیے گئے ہیں ان کے خلاف مشترکہ اقدامات اٹھانے کے لیے او آئی سی کو آمادہ کرنے کی حکومت نے کیا کوششیں کی ہیں؟

میں محترم وزیر صاحب سے جاننا چاہوں گا کہ برہنہ تلاشی والے جس مسئلے کو میں نے اٹھایا ہے اس پر انہوں نے کیا اقدام کیا ہے۔ بلاشبہ امریکہ کی یہ پالیسی ہماری قومی عزت، حمیت اور آزادی ہر ایک پر وار ہے۔ جن ۱۴ ممالک کی اس معاملے میں امریکہ نے نشاندہی کی ہے ان میں پاکستان کو شامل کیا گیا ہے۔ آپ نے یہ صحیح کہا ہے کہ ان کا اقدام غیر منصفانہ ہے آپ نے شاید احتجاج بھی کیا ہے لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے پیش نظر ہم نے کیا اقدامات کیے ہیں اور آخر ہم نے او آئی سی کو متحرک کیوں نہیں کیا جبکہ ۱۴ ممالک میں ۱۳ مسلمان ممالک ہیں؟ او آئی سی خود کرے یا نہ کرے لیکن ہم متاثرہ فریق ہیں ہمیں تو اس کو مسترد کرنا ہی چاہیے۔ سارے مسلمان ممالک کو مل کر احتجاج کرنا چاہیے۔ اب بھی ہم احتجاجی اقدام نہیں کریں گے تو ہماری قومی غیرت کب جاگے گی؟

جناب والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں اور منسٹر صاحب اس کا جواب دیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ معاملہ وزارت خارجہ کے براہ راست دائرہ کار میں نہ ہو لیکن کیا حکومت کے اختیار میں بھی نہیں ہے۔ کیا وزارت داخلہ اور وزارت خارجہ معاملات پر مشترکہ کام نہیں کرتے ہیں؟ یعنی آپ کی پالیسی مربوط ہونی چاہیے۔ براہ کرم اس سوال کا جواب دیجیے۔ او آئی سی کے بارے میں آپ نے جو بات کہی ہے وہ غیر واضح ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر کن وجوہ سے آپ نے اس معاملے کو دوطرفہ قرار دیا حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ آج کی دنیا میں جب مختلف ذرائع سے دباؤ پڑتا ہے تب ہی چیزیں آگے بڑھتی ہیں اور اس معاملہ میں بھی دباؤ ڈالنے کا راستہ یہی ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ:

> مسافروں کی جامہ تلاشی کے بارے میں امریکی قوانین کے خلاف او آئی سی نے مشترکہ اقدامات کیے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ پاکستان اس مسئلہ کو او آئی سی کے پلیٹ فارم پر اٹھانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔

سوال یہ ہے کہ جب مسلم ممالک اور ان کے شہریوں پر پابندی لگتی ہے تو او آئی سی کس مرض کی دوا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ او آئی سی کا ایک رابطہ کار گروپ اقوام متحدہ کے اندر بھی ہے اور او آئی سی کے اندر ۵۷ ممالک ہیں۔ اس پلیٹ فارم کو متحرک کریں تو اس پر ہم سیاسی دباؤ پیدا کر سکتے ہیں ورنہ یہ کام نامکمل ہو گا۔ ان دونوں باتوں کا آپ جواب دیں۔ ایک اہم پلیٹ فارم کو ماضی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اب آپ نے اسے کیوں استعمال نہیں کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ دوطرفہ معاملات میں گورنمنٹ اسے اتنا ہلکا کیوں کیوں لے رہی ہے اور امریکہ کو یہ پیغام کیوں نہیں دیا جا رہا کہ آپ ہمارے ساتھ یہ کریں گے تو جواباً آپ کو بھی بھگتنا پڑے گا۔ (۳۱ مارچ ۲۰۱۰ء)

ریمنڈ ڈیوس کے ہاتھوں دو پاکستانی نوجوانوں کا قتل

جناب والا! میں آپ کی توجہ لاہور میں ہونے والے واقعہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا

ہوں۔ اس واقعہ میں ایک امریکی ریمنڈ ڈیوس کے ہاتھوں دو نوجوانوں کی شہادت اور پھر اسے فرار کرانے کے لیے آنے والی امریکن قونصلیٹ کی گاڑی کے ذریعے ایک اور نوجوان کی شہادت ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ملک کے اندر اور ملک کے باہر سے پاکستان پر دباؤ استعمال کیا جارہا ہے۔ امریکن ایمبیسی اس معاملے میں تین سرکاری نوٹیفکیشن جاری کر چکی ہے۔ ان کے پارلیمینٹرین جو یہاں آتے ہیں وہ کبھی یہاں کی پارلیمنٹ کے ممبران سے نہیں ملتے لیکن وہ سربراہ مملکت سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان رابطوں کے حوالہ سے بڑی عجیب وغریب معلومات سامنے آرہی ہیں۔ چنانچہ ABC Network اور اسی طریقے سے بہت ہی مشہور Washington Post اور US News دونوں میں یہ بات آئی ہے کہ ریمنڈ ڈیوس ایک پرائیویٹ سیکورٹی کمپنی کا ملازم ہے۔ کمپنی کا نام Hyperian Protective Consultants ہے اور اس کے باوجود کوشش یہ کی جارہی ہے کہ اس قاتل کو سفارتی آداب کا بہانہ بنا کر رہا کرالیا جائے اور اس طرح پاکستانیوں کا خون، پاکستانیوں کی عزت، پاکستان کی آزادی اور حاکمیت، ان سب کا مذاق اڑایا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بات کو صاف الفاظ میں کہوں کہ یہ تمام باتیں اس قوم اور پارلیمنٹ کی توہین کے مترادف ہیں۔

جناب والا! مجھے دکھ سے کہنا پڑرہا ہے کہ محترم وزیر تعلیم صاحب نے کل ٹی وی چینلز پر اس حوالہ سے بات کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وزیر تعلیم کو اس بات کا کیا حق ہے کہ ایک ایسا مسئلہ جس کا تعلق دفتر خارجہ یا وزیر اعظم سے ہے، اس پر وہ وکالت کریں؟ وہ مجرم کے لیے عدالتی کارروائی سے استثنیٰ کی بات کریں اور یہ کہیں کہ اس کو باہر بھیج دیا جائے گا۔ یہ تمام چیزیں بڑی خطرناک ہیں۔ اس کا فوری نوٹس لینا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے کو جماعتی وابستگی سے ہٹ کر لیا جائے۔ اس میں حکومت اور اپوزیشن کا کوئی تنازعہ نہیں ہے، یہ پوری قوم کا مسئلہ ہے۔ اگر اس معاملے میں حکومت نے امریکی دباؤ کے تحت کوئی اقدام کیا تو میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ وہ پھر عوامی احتجاج کو دعوت دے گی۔ ہمیں اچھے طریقے سے

سمجھنا چاہیے کہ اس سلسلے میں قانون کے مطابق ہی معاملہ ہونا چاہیے اور واضح کر دینا چاہیے کہ قانون سے بالاتر کوئی نہیں ہے۔

جناب والا! اب تک جو معلومات اس ضمن میں سامنے آئی ہیں وہ بہت افسوسناک صورت حال کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ابھی تک سامنے آنے والا نام یعنی ریمنڈ ڈیوس بھی اس کا اصل نام نہیں ہے، اس کے پاس اسلحہ کا کوئی لائسنس نہیں تھا اور اس نے اس پوری کارروائی کے دوران کرائے کی کار کو استعمال کیا۔ سوال یہ ہے کہ مزنگ [لاہور] میں وہ کیا کر رہا تھا؟ اس کی کار سے جو چیزیں نکلی ہیں، ان میں نقشے، دوربین اور اسلحہ ہے۔ یہ ساری چیزیں کن مقاصد کے لیے ہیں؟ میں یہاں یہ بات بھی عرض کر دوں کہ غیر ملکی [امریکی] ویب سائٹ خاص طور پر 'The Nation' نے یہ بات کہی ہے کہ ۲۰۰۴ء یا ۲۰۰۵ء میں مشرف صاحب نے کوئی ایسا معاہدہ کیا ہے جس میں مشترکہ آپریشن کے نام پر امریکی CIA اور CIA کے جعلی کھلاڑیوں کو جن میں یہ شخص اور اس کی کمپنی بھی شامل ہے ہمارے یہاں سرگرمی کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کمپنی نے عراق میں بھی یہ کردار ادا کیا ہے جہاں ان کے تقریباً دو سو افراد سرگرم تھے۔ 'نیشن' کا یہ بھی کہنا ہے کہ پاکستان میں ان کے ساٹھ سے ستر افراد آپریشن کر رہے ہیں۔ جن میں سے چالیس کراچی میں ہیں، سات یا آٹھ لاہور میں اور اسی طرح کچھ کوئٹہ اور پشاور میں ہیں۔ اس پورے معاملہ کا نوٹس لینا بہت ضروری ہے اور ہمارا فرض ہے کہ سینیٹ اور پارلیمنٹ کی طرف سے ہم اس معاملے میں بالکل واضح بات کریں۔ (یکم فروری ۲۰۱۱ء)

ایران پاکستان گیس پائپ لائن

میں آپ کا اور وزیر صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جناب! راجہ ظفر الحق نے بڑے اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے اور میں نے بھی اسی مسئلے پر ایک تحریک التواء بھیجی ہوئی ہے۔

جناب چیئرمین! اگر ہم کھل کر بات کریں تو امریکہ کو یہ بات بہت ناپسند ہے کہ ایران سے ہمارے تعلقات اس طرح ادارتی سطح پر قائم ہوں کہ ایران، پاکستان مل کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ معاہدہ سے نکلنے کے لیے بھارت پر دباؤ ڈالا گیا، اور وہ چونکہ امریکہ سے ایٹمی معاہدہ کر رہے تھے اس لیے ایران کے ساتھ گیس پائپ لائن معاہدے سے باہر نکل گئے۔ دوسرا منصوبہ ایران، پاکستان اور چائنا کے درمیان ہے اور مستقبل کے لیے یہ ایک بہت بڑا موقع ہے لیکن دونوں معاملات میں حکومت کی طرف سے کمزوری دکھائی جا رہی ہے جو ملک کے لیے تباہ کن ہے۔

میں راجا ظفر الحق صاحب کے ساتھ آواز ملا کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت اس معاملے میں امریکہ کی غلامی سے نکلے اور اپنے مفاد کو دیکھے۔ اس وقت کھیل یہ ہے کہ امریکہ اپنے تزویراتی مفادات کے لیے ہمیں استعمال کر رہا ہے۔ ابھی ۲۲ مارچ کے Guardian [لندن] کے ایک شمارے میں ایک یونیورسٹی پروفیسر کا مضمون آیا ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ اصل مسئلہ اس وقت یہ ہے کہ امریکہ پاکستان کو امریکی مفادات آگے بڑھانے کے لیے استعمال کر رہا ہے جو کہ پاکستان کے مفاد میں نہیں ہے۔ یعنی باہر والے یہ بات کر رہے ہیں اور ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گیس پائپ لائن اور بجلی کی لائن دونوں کا معاملہ ایک دوسرے سے مربوط ہے اور گیس اور بجلی دونوں چیزوں کے لیے ہمیں ایران سے تعاون کرنا چاہیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مکران میں پہلے سے بجلی ایران سے آ رہی ہے اور وہاں کے لوگ اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ پچھلے دنوں اس میں بھی اتار چڑھاو آیا ہے۔ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے اور حکومت کو اس معاملے میں ایک آزاد پالیسی جو پاکستان کے مفاد میں ہو اختیار کرنی چاہیے۔ (۷ اپریل ۲۰۱۰ء)

امریکہ کی عالمی پالیسیاں اور ان پر ردِ عمل

موجودہ عالمی نظام کی تشکیل کے وقت سے ہی امریکہ کو اس میں ایک نہایت غیر معمولی مقام حاصل رہا ہے۔ سرد جنگ کے خاتمہ اور سوویت یونین کے انہدام کے فوری بعد تو بظاہر اسے کوئی ادنیٰ چیلنج بھی درپیش نہ تھا۔ امریکہ کے پاس یہ موقع تھا کہ وہ انصاف پر مبنی عالمی نظام کی تشکیل میں آگے بڑھ کر کوئی کردار ادا کرتا۔ اس کے برعکس امریکی پالیسیاں نہ صرف اپنے مفادات کے گرد گھومتی رہیں بلکہ ان مفادات کی تکمیل کے لیے اس کی جانب سے جارحانہ طرز عمل اختیار کیا گیا۔ اس ضمن میں امریکی حکمت عملی کا ایک اہم نکتہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو عنوان بنا کر دنیا میں اپنی مرضی کے اقدامات کے لیے جواز پیدا کرنا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ اب امریکہ کو اپنے اس رویہ کی قیمت بھی ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ تاہم اس موضوع سے قطع نظر ایک اہم سوال یہ تھا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کے ایک اہم حلیف کی حیثیت سے پاکستان نے مختلف عالمی امور میں کیا کردار ادا کیا۔ کتاب کے اس حصہ میں اسی تناظر میں چند اہم واقعات پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

عراق پر حملہ - امریکی عزائم اور جرائم

حزب اختلاف کی جماعتوں کی جانب سے سینیٹر رضا ربانی، مولانا سمیع الحق، سینیٹر ثناء اللہ بلوچ اور پروفیسر خورشید احمد نے قاعدہ ۱۹۴ کے تحت عراق پر امریکی حملہ (۲۰ مارچ ۲۰۰۳ء) کے حوالہ سے کی صورت حال پر بحث کے لیے تحریک پیش کی۔

جناب چیئرمین! اس وقت عراق کے ۲۲ ملین افراد پر آگ اور خون کی بارش کی جارہی ہے۔ پاکستان کے عوام، امت مسلمہ اور پوری دنیا کے امن پسند اور حق پرست انسان اس صورتحال پر رنجیدہ اور افسردہ ہیں، غم وغصے کا اظہار کر رہے ہیں اور دنیا کے دو سو سے زیادہ شہروں میں امریکیوں سمیت پانچ کروڑ سے زیادہ انسان اس ظلم، دہشت گردی، وحشت اور بربریت پر احتجاج کر رہے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ مسئلہ عراقی صدر صدام حسین کا نہیں۔ نہ ہی یہ صدام کی فوجی کابینہ کا مسئلہ ہے۔ صدام کو صدام امریکہ، برطانیہ اور مغرب کی اقوام نے بنایا۔ ایران پر حملہ کرنے کے لیے صدام کو پیسہ اور اسلحہ انہوں نے دیا۔ جس وقت صدام ایرانیوں اور کُردوں پر گیس استعمال کر رہا تھا، وہ گیس امریکی اور برطانوی کمپنیاں فراہم کر رہی تھیں اور اس کے لیے سرمایہ بھی وہیں سے آرہا تھا۔ اس وقت امریکی وزیر دفاع رمز فیلڈ بغداد میں موجود تھے اور صدام صاحب کو مشورے دے رہے تھے۔ اس لیے سمجھ لینا چاہیے کہ مسئلہ صدام کا نہیں ہے، مسئلہ اصول کا اور مظلوم انسانوں کے تحفظ کا ہے۔ اس لیے میں جناب والا! آپ کے توسط سے پوری دنیا کے سامنے یہ بات رکھنا چاہتا ہوں کہ عراق کے خلاف جنگ ایک جارحانہ اور غیر قانونی جنگ ہے۔

عراق پر حملہ دراصل ایک ظالمانہ اقدام، ایک جنگی جارحیت اور ایک غیر منصفانہ،

بلاجواز، غیر اخلاقی مہم جوئی ہے جس کے نتیجے میں آٹھ دنوں میں کئی ہزار معصوم انسان شہید ہو چکے ہیں۔ ڈیزی کٹر بم، بنکر تباہ کرنے والے میزائل اور یورینیم سے افزودہ بم امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی جانب سے پھینکے جا رہے ہیں۔ نتیجتاً ہر طرف یورش جاری ہے۔ یہ ایک انسانی اور عالمی اور سب سے بڑھ کر ایک اصولی مسئلہ ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس پر دنیا کے عوام جو آواز اٹھا رہے ہیں، اس میں پاکستان بھی اپنا بھرپور کردار ادا کرے۔

جناب والا! عراق میں جنگ کے سلسلے میں امریکہ کی جانب سے جو وجوہات دی گئیں وہ دھوکہ دہی اور جھوٹ پر مبنی ہیں۔ امریکہ کی جانب سے کہا گیا کہ مسئلہ بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیاروں کا ہے۔ جواباً عراق نے اقوام متحدہ کے مبصرین کو بلایا اور انہوں نے تین رپورٹیں سلامتی کونسل کو دیں۔ ان رپورٹوں میں صاف کہا گیا کہ عراق نگرانی اور تحقیقات کے عمل میں تعاون کر رہا ہے اور ہمیں کوئی مشکوک چیز نہیں ملی۔ اس پر مسئلہ کی نوعیت کو بدلا گیا، کہا گیا کہ صدام آمر ہے۔

بلاشبہ صدام ایک آمر ہے لیکن کتنے آمر ہیں جن کے خلاف آپ نے جنگ کی اور کیا محض کسی کا آمر ہونا آپ کو کوئی حق دیتا ہے کہ آپ اس کے خلاف جنگ کریں؟ کہا گیا کہ اس نے اپنے عوام پر ظلم کیا ہے جبکہ وہ جمہوریت چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کتنے آمر ہیں جن کی آپ پشت پناہی کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں اور کیا دنیا کا کوئی قانون کسی کو اختیار دیتا ہے کہ جمہوریت کے نام پر دوسرے ممالک میں آپ حکومت تبدیل کریں، لوگوں کو ماریں، تباہ کریں اور پھر کہیں کہ ہم تعمیر کریں گے۔

کہا گیا کہ میرے باپ کے خلاف انہوں نے حملہ کرایا[1]۔ جناب والا! کوئی ایک بھی

---

[1] اشارہ ہے امریکی صدر بش کے بیان کی جانب جس میں انہوں نے اپنے والد جارج ایچ ڈبلیو بش پر حملہ کی سازش کا ذکر کرتے ہوئے صدام حسین پر الزام لگایا تھا۔ بش کے والد ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۳ء تک امریکہ کے صدر رہے تھے اور اپریل ۱۹۹۳ء میں کویت کے دورے کے دوران ان کی کار میں بم رکھنے کی منصوبہ بندی کو ناکام بنایا گیا تھا۔

دلیل نہیں دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اپنی ساری کوشش کے باوجود، جس میں رشوت، کھینچاتانی اور دھمکانا سب کچھ شامل تھا، سلامتی کونسل میں تائید حاصل نہ کر سکا۔

اس لیے جناب والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ دراصل عراق پر حملہ نہ صدام کی وجہ سے ہے اور نہ ہی امریکہ کی بیان کی ہوئی دیگر کسی وجہ سے ہے۔ یہ دراصل ایک سوچے سمجھے استعماری منصوبے کا حصہ ہے۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۹۱ء میں جنگ کے بعد ایک ٹاسک فورس قائم کی گئی تھی۔ اس ٹاسک فورس میں موجودہ امریکی حکومت کے کم از کم چار ذمہ دار افراد موجود تھے اور اس ٹاسک فورس نے ۱۹۹۲ء کی رپورٹ میں یہ بات کہی تھی کہ ہمیں عراق سے نمٹنا ہے یہ ایک نا تکمیل شدہ ایجنڈا ہے۔ اب آپ یہ دیکھیے کہ ۹/۱۱ کو جو واقعہ ہوا ہے، اس کے چھ دن بعد بش صاحب ڈھائی صفحے کی ایک خفیہ یادداشت پنٹاگون کو بھیجتے ہیں، جس میں کہا جاتا ہے کہ ہمیں اب افغانستان پر حملہ کرنا ہے۔ لیکن آخری پیرا گراف یہ ہے کہ عراق پر حملے کی تیاری کرو۔ یہ بش صاحب کی ۱۷ ستمبر ۲۰۰۱ء کی یادداشت ہے۔ پھر اس کے بعد ستمبر ۲۰۰۲ء میں ان کی جانب سے جو حکمت عملی دی گئی ہے، اس میں یہ اصول پیش کیا گیا ہے کہ ہم جہاں چاہیں حکومت تبدیل کر سکتے ہیں۔ پیش بندی کے نام پر حملے (Pre-emptive strike) کا ایک اصول بیان کیا گیا ہے، اپنے دفاع کی جو متفق علیہ تعریف تھی، اس کو بدل دیا گیا ہے۔

امریکہ کے مقاصد

میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے جو حملہ کیا ہے اور جس طرح جنگ کے شعلوں میں عراق کو بھسم کر دیا ہے، اس کے تین بنیادی اسباب ہیں۔

پہلا سبب یہ ہے کہ امریکہ دنیا پر جو امریکن ورلڈ آرڈر یا نیا سامراج قائم کرنا چاہتا ہے، یہ اس کا حصہ ہے۔ عراق کی لڑائی صرف عراق کے لیے نہیں، عراق کی لڑائی کا خطرہ آج دنیا کے سارے ممالک کو محسوس کرنا چاہیے اور اگر خدانخواستہ عراق میں یہ جنگ

کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر ایک ایک کر کے باقی سب کی باری آنی ہے۔ اس لیے اس حملہ کو دراصل امریکی سربراہی میں نئے عالمی نظام کے قیام کی کوششوں کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔

دوسرا سبب تیل ہے۔ اس وقت امریکہ کی قیادت پر تیل کی لابی اور فوجی صنعتی کمپلیکس (Military Industrial Complex) کا قبضہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ امریکہ کے پاس دنیا کے تیل کے ذخائر کا صرف ۲ فی صد ہے جبکہ عراق کے پاس ۱۱ فی صد اور اس کے پڑوسی سعودی عرب میں ۲۲ فی صد ہے، اس ساری جنگ کا مقصد اس تیل پر قبضہ کرنا ہے۔ امریکہ اپنی ضروریات کا ۳۰ فی صد باہر سے منگوا رہا ہے لیکن یورپ اور جاپان ۹۰ فی صد تیل باہر سے منگواتے ہیں۔ دراصل تیل پر قبضے کے معنی یہ ہیں کہ امریکہ یورپین ممالک پر اور ان تمام ممالک پر بھی جو مشرق وسطیٰ کے تیل پر انحصار کرتے ہیں، تیل کا ہتھیار استعمال کر سکے گا۔

تیسرا سبب ہے مشرق وسطیٰ کی تنظیم نو جسے واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

امریکہ کے پانچ جرائم

جناب والا! یہ تین بنیادی مقاصد ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر آپ دیکھیں تو امریکہ نے جو کچھ کیا ہے، وہ میری نگاہ میں پانچ جرائم ہیں جو انسان کشی کے ساتھ ساتھ اس وقت امریکہ کی اس جنگ کی بنا پر ہو رہے ہیں۔

پہلا یہ ہے کہ امریکہ نے یہ اصول وضع کیا ہے کہ وہ بین الاقوامی قانون سے بلند و بالا ہے۔ وہ کسی قانون کے تابع نہیں ہے۔ اس کی یہ پالیسی آپ اس طرح دیکھیے کہ جتنے بھی بین الاقوامی ادارے ہیں ان سے امریکہ کس طرح نکلا ہے۔ کم از کم چار عالمگیر معاہدے ہیں جن سے یکطرفہ طور پر امریکہ باہر نکلا ہوا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۲۰ء کے معاہدے، ۱۹۲۸ء میں پیرس معاہدہ اور اس کے بعد اقوام متحدہ کا چارٹر سب میں ذاتی تحفظ کا یہ اصول تسلیم کیا گیا ہے کہ یو این چارٹر کے چیپٹر ۷ کے تحت آپریشنل فیصلے کے علاوہ جنگ

جائز نہیں ہے۔ امریکہ نے کھلے بندوں اس کی خلاف ورزی کی ہے۔

جناب والا! دوسری چیز میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ نے اقوام متحدہ کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا ہے۔ اس کو محض امریکی پالیسی کا ڈھنڈورچی بنانے کی کوشش کی۔ اس وقت تو سلامتی کونسل میں کھلی رشوت، دباؤ، بلیک میل اور ہارس ٹریڈنگ کے طریقے اختیار کیے گئے ہیں اور یہ صاف کہہ دیا گیا ہے کہ اگر اقوام متحدہ قرار داد پاس نہیں کرتی تو ہم اس کے بغیر آزادانہ اپنا کام کریں گے اور انہوں نے کر کے دکھا دیا۔ درحقیقت یہ اقوام متحدہ پر کاری ضرب لگائی گئی ہے اور دوسری جنگ کے بعد امن عالم کے لیے جو نظام بنا ہے، اس کو امریکہ تہہ وبالا کر رہا ہے۔

تیسری بات جناب والا! ایک خطرناک ارادہ حکومتوں کی تبدیلی (Regime change) کا ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، کسی کو یہ اختیار نہیں کہ دنیا کے جس ملک میں چاہے اس کی قیادت کو تبدیل کر دے اور نئی قیادت وہاں پر لے آئے۔

چوتھی چیز جناب والا! پیشگی حملے (Pre-emptive strike) کا اصول، جس نے ذاتی دفاع کے تصور کو بالکل بدل دیا ہے اور پھر آخری چیز جناب والا! یہ ہے کہ اس نے دنیا کے کمزور ممالک کو بلیک میل اور رشوت زدہ کیا، خاص طور پر ترکی کے معاملے میں آپ دیکھیے کہ کس طرح ترکی کو ۲۶ بلین ڈالر دینے اور یورپی یونین کی ممبر شپ کا لالچ دیا۔ لیکن میں سلام کرتا ہوں ترکی کی پارلیمنٹ کو کہ اس نے ان تمام چیزوں کا سامنا کیا اور اپنی خود انحصاری کے ساتھ کیا۔

جناب والا! یہ پانچ بنیادی جرائم ہیں جو اس وقت امریکہ کر رہا ہے اور اگر اس کو یہ سب کچھ کرنے دیا گیا تو مجھے کہنے دیجیے کہ عالمی نظام تہہ وبالا ہو جائے گا۔ عالمی سلامتی کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور کوئی محفوظ نہیں رہے گا۔ اس لیے یہ محض عراق کی جنگ نہیں ہے۔ یہ پوری دنیا کے انسانوں کی جنگ ہے۔ یہ تمام ممالک اور انسانیت کی جنگ ہے۔

پاکستان کی ذمہ داری کیا ہے؟

جناب والا! میں آخر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی اس وقت ذمہ داری کیا ہے؟ میری نگاہ میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ پاکستان کو اچھی طرح یہ بات سمجھ لینی چاہیے حق و باطل کی اس کشمکش میں کوئی کمزوری دکھانا اور محض اس بنیاد پر کہ امریکہ ہمارا 'دوست' ہے، اور امریکہ کے ساتھ دہشت گردی کی نام نہاد جنگ میں ہم شریک کار ہیں اس لیے ہم مجبور ہیں جو امریکہ چاہے وہ کرے۔ یہ قطعاً غلط اور نا قابل قبول ہے۔ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارا تعلق امریکہ سے اٹلانٹک معاہدے (نیٹو) سے زیادہ تو نہیں ہے، وہ تو ایک فوجی معاہدہ ہے لیکن اس کے باوجود نیٹو کے کئی ممالک نے اصول کی بنیاد پر امریکہ کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ اس کو چیلنج کیا۔

یہ بات بھی میں کہنا چاہتا ہوں کہ کچھ لوگ سوال اٹھاتے ہیں کہ عراق نے ہمارے ساتھ کیا، کیا ہے؟ جناب والا! یہ ایشو نہیں ہے، عراق نے ہمارے ساتھ کچھ بھی نہ کیا ہو، لیکن یہ اصول اور انسانیت کا مسئلہ ہے۔ میں یہ بھی آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ دوسرے اور بالخصوص مسلمان ممالک نے ہمارے ساتھ کیا کیا؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کڑے وقت میں چین نے اور سعودی عرب، ایران اور ترکی نے، حتٰی کہ ۱۹۶۵ء میں انڈونیشیا نے بھارت سے دوستی کے باوجود کھلے بندوں پاکستان کا ساتھ دیا ہے۔ یوں بھی مسئلہ اصول کا ہوتا ہے، مفادات کا نہیں ہوتا۔ اس لیے میں کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم صاف الفاظ میں یہ پیغام دیں کہ یہ جنگ غیر اخلاقی، نامنصفانہ اور بلا جواز ہے۔ محض یہ کہنا کہ اس میں امریکہ کا ساتھ دینا ہمارے لیے مشکل ہے۔ یہ بڑا کمزور مؤقف ہے۔ یہ تضاد فکری نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں صاف کہنا چاہیے کہ ناانصافی پر مبنی جنگ ہے اور ہم اس جنگ کو انسانیت کے خلاف اور اقوام متحدہ کے قوانین کی خلاف ورزی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اس کو روکنا اور اس کے خلاف کام کرنا یہ ہمارا بنیادی فرض ہے۔

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں جناب والا! کہ یہ موقع ہے کہ ہمیں خود اپنی خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ نظر ثانی کے معنی یہ نہیں کہ ہم یوٹرن لے لیں یا محاذ آرائی پیدا کر لیں۔ نظر ثانی کے معنی یہ ہیں کہ آپ نئے راستے جو رونما ہو رہے ہیں ان سے فائدہ اٹھائیں اور میں صاف کہنا چاہتا ہوں، بلکہ یہ میں ہی نہیں کہہ رہا خود جنرل مشرف صاحب نے یہ بات کہی ہے کہ آئندہ پاکستان کی باری بھی ہو سکتی ہے۔ جناب والا! آج اس کے لیے تیاری کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی تیاری کرنے کے لیے آپ کو اپنے گھر میں کچھ کام کرنے ہوں گے اور اپنی خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کرنا ہو گی۔

تیسرا کام جناب والا! خود انحصاری کا حصول ہے۔ خود انحصاری کے بغیر نہ کوئی قوم اپنی آزادی کو محفوظ رکھ سکتی ہے نہ اپنی خود مختاری کا دفاع کر سکتی ہے اور نہ دنیا میں سیاسی اور معاشی میدان میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس لیے تیسری چیز یہ کہ خود انحصاری ہماری ترجیح ہونی چاہیے۔

چوتھی چیز جناب والا! میری نگاہ میں امت مسلمہ کا اتحاد ہے۔ بلا شبہ آج مسلمان حکومتوں کا رویہ نہایت بزدلانہ اور امت اور عوام کی خواہشات، آرزوؤں، تمناؤں اور مطالبات کے برعکس ہے۔ آج مسلمانوں کی قیادت اور مسلمان عوام کے درمیان کشمکش ہے، تصادم، بغض اور بڑی خلیج ہے۔ لیکن امت ہمارے لیے اہم ہے۔ حکمراں اہم نہیں ہیں اور یہ حکمراں بھی بالآخر امت کے دباؤ کی بنا پر رویہ تبدیل کرنے پر مجبور ہوں گے۔ آپ دیکھیے عرب لیگ نے پہلی مرتبہ کھلے الفاظ میں یہ کہا ہے کہ یہ جارحانہ جنگ ہے، اسے ختم ہونا ہے۔ آج امت مسلمہ کا اتحاد چوتھی ضرورت ہے۔

میری نگاہ میں اگلی ضرورت یہ ہے کہ اس وقت نئی عالمگیر گروہ بندی ہو رہی ہے۔ دنیا اس وقت یک قطبی سے کثیر قطبی کی طرف چلنا شروع ہو گئی ہے۔ فرانس، جرمنی، بیلجیم، روس، چین حتیٰ کہ امریکہ کے دونوں ہمسائے کینیڈا اور میکسیکو سب نے حملہ نہ کرنے اور اب جنگ روکنے پر زور دیا ہے۔ اس طرح ایک نیا اتحاد وجود میں آرہا ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ

ہم نئے مواقع میں اپنا مقام پیدا کریں۔ اپنے آپ کو اس ابھرتے ہوئے کیمپ سے وابستہ کریں، بات چیت کا راستہ کھولیں، اس کی قوت میں اضافہ کریں اور اس کے ذریعے اپنی قوت میں اضافہ کریں۔

آخری چیز جناب والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کام کے لیے ایک قومی اتفاق رائے پیدا کرنا ضروری ہے۔ نظریہ، معیشت، قومی سلامتی و دستور وہ چیزیں ہیں جن پر قومی اتفاق رائے کی ضرورت ہے۔ یہ وقت عصبیت کی بنیاد پر ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کا نہیں ہے بلکہ قوم کو اس لائق بنانے کا ہے کہ خود ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ عالمی میدان میں عراق کے مجبور اور مظلوم مسلمانوں کی تائید کریں اور ان سے تعاون کریں۔ کم از کم اپنی آواز اٹھائیں۔ حضور پاک ﷺ نے تعلیم دی ہے کہ جب تم کسی برائی کو دیکھو اور اس کو اپنے ہاتھ سے روک سکتے ہو تو اسے ہاتھ سے روکو، اگر ہاتھ سے نہیں روک سکتے ہو تو اس کے خلاف زبان سے احتجاج کرو اور اگر یہ بھی تمہارے لیے ممکن نہیں ہے تو ایمان کا ضعیف ترین درجہ یہ ہے کہ اسے دل میں برا سمجھو۔

جناب والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں زبان سے اور ہر اس ذریعہ سے جو ہم اختیار کر سکتے ہیں، اس کی مذمت کرنی چاہیے۔ اس میں بے پناہ امکانات موجود ہیں۔ عالمی رائے عامہ کا اثر پڑا ہے اور پڑ رہا ہے۔ بش کو بھی سوچنا پڑ رہا ہے، خود امریکہ کے عوام اٹھ رہے ہیں۔ ہمیں اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ ان تمام کارروائیوں کے اثرات لازماً ہوں گے۔ امریکہ کی بھی اتنی معاشی قوت نہیں ہے کہ وہ لامحدود جنگ کو جاری رکھ سکے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ایک بلین ڈالر یومیہ خرچہ تھا اور جنگ کے پانچویں دن بش صاحب نے ۷۵ بلین ڈالر کا مطالبہ کیا ہے۔ امریکہ کے ماہرین معیشت یہ کہہ رہے ہیں کہ اس جنگ کے اخراجات دوسو بلین سے لے کر ۱ اٹریلین تک ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے سپر پاور کے لیے بھی مہم جوئی کی کوئی نہ کوئی حد ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ایک مثبت، متحرک اور پیش قدمی پر مبنی پالیسی اختیار کریں اور گومگو کے عالم سے، معذرت خواہانہ انداز سے نکلیں۔

وقت کی ضرورت یہ ہے کہ ہم اس مسئلے کو اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں پیش کریں۔ ہم اس کے ممبر ہیں۔ عجیب وغریب بات یہ ہے کہ ہم شرمندگی محسوس کر رہے ہیں کہ کاش ہم اس وقت یو این سیکورٹی کونسل کے ممبر نہ ہوتے، اس سے زیادہ کمزوری کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ آپ سرگرمی سے حصہ لیجیے، آپ وہاں رائے عامہ کو ہموار بنائیے، آپ جنگ کی مذمت کرنے کے لیے تحریک پیش کیجیے، آپ جنگ بندی کا مطالبہ کیجیے اور اگر سیکورٹی کونسل میں ویٹو آتا ہے تو پھر ایک اصول موجود ہے۔ کوریا کے سلسلے میں ۱۹۵۰ء میں یو این چارٹر میں تبدیلی کی گئی تھی اور یہ لایا گیا کہ مشترکہ طور پر امن کی قرار داد کو جنرل اسمبلی میں لایا جاسکتا ہے جسے دو تہائی اکثریت سے اگر قبول کر لیا جائے تو اس کی حیثیت لازمی پابندی کی ہے۔ یہ ہمارے لیے غیب سے ملنے والے مواقع کی طرح ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے اور آج یو این اسمبلی کا اجلاس جاری ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ آپ کو اجلاس بلانا پڑے۔ اس لیے ان تمام چیزوں کو نظر انداز نہ کیجیے، متحرک پالیسی اختیار کیجیے، اس سے آپ اپنا دفاع کریں گے، اس سے آپ عراق کے سلسلے میں صحیح مؤقف پیش کریں گے۔ اس سے آپ پوری دنیا کے انسانوں کے ساتھ، جو امن چاہتے ہیں، جو جنگ کے خلاف ہیں، جو بش کی اس جارحیت کے خلاف اٹھ گئے ہیں، شانہ بشانہ اور یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے ایک نئے عالمی دور کی طرف بڑھ سکیں گے۔

وقت لگے گا لیکن مجھے یقین ہے کہ امریکہ کے زوال کا آغاز ہو گا اور دنیا یک قطبی کی بجائے کثیر قطبی دنیا کی طرف جائے گی۔ مکھی پر مکھی نہ ماریے۔ ماضی کی پالیسی جاری نہ رکھیے بلکہ نئے اقدامات، نئے چیلنجوں اور نئے مواقع کی روشنی میں راستہ اختیار کیجیے۔ میں پوری دردمندی کے ساتھ حزب اقتدار اور حزب اختلاف، سب سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس کو آپ باہم تصادم اور تضاد کا مسئلہ نہ بنائیں، مقامی مسئلہ نہ بنائیں، یہ ایک عالمی مسئلہ ہے، یہ اصول کا مسئلہ ہے۔ آیئے اس پر مل کر نئی کوشش کریں۔ اپنے ملک کو بھی اور دنیا کو بھی ایک نیا پیغام دیں۔

(۲۷ مارچ ۲۰۰۳ء)

عراق پر امریکی حملہ کے مضمرات

جناب چیئرمین! میں قاعدہ ۱۹۴ کے تحت یہ تحریک پیش کر رہا ہوں۔

جناب چیئرمین! میں آپ کا اور قائد ایوان کا بے حد ممنون ہوں کہ حزب اختلاف نے جن موضوعات پر گفتگو کے لیے یہ اجلاس طلب کیا تھا، ان میں سے پہلے یعنی بلوچستان کے موضوع پر اگرچہ تفصیل سے بحث نہیں ہو سکی اور بہت سے ساتھی جنہوں نے اپنے نام دیے تھے، وہ اپنے خیالات کا اظہار نہ کر سکے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جتنی گفتگو ہوئی الحمدللہ ایک اچھا آغاز ہوا ہے۔ اس بحث کا نتیجہ نکلا ہے کہ مل جل کر مسئلے کے اسباب کی تلاش اور حالات کی اصلاح کے بارے میں سفارشات مرتب کرنے کے لیے سینیٹ کی پارلیمانی کمیٹی بن گئی ہے۔

دوسرا مسئلہ جس پر ہم نے یہ اجلاس بلایا ہے، وہ عراق کا ہے۔ میں آپ کی اجازت سے چند مختصر گزارشات اس مسئلے کے بارے میں کروں گا۔ پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ عراق میں جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے تین پہلو ہیں جنہیں ضروری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

حملہ پر ہمارا ردعمل

پہلا جس کا تعلق ہمارے جذبات، احساسات، ہماری دینی روایت اور ہماری تاریخ سے ہے وہ یہ کہ اس وقت امریکہ اور اس کے حواریوں کی فوجیں جس بے دردی،، بے رحمی اور بے حسی کے ساتھ بغداد، نجف الاشرف، فلوجہ اور دوسرے تمام مقامات پر بمباری کر رہی ہیں، وہ ہمارے لیے بہت اذیت ناک ہے۔ امریکہ اور اس کے اتحادی نہ صرف شہریوں کو

شہید کر رہے ہیں بلکہ اندھا دھند عمارتیں ڈھائی جارہی ہیں جن میں مقدس مقامات بھی شامل ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے روضہ اور دیگر اہم تاریخی قبرستانوں کو جس طرح نشانہ بنایا جارہا ہے وہ بے حد افسوس ناک ہے۔ ان تمام چیزیں کا تعلق کسی فرقے یا علاقے سے نہیں ہے۔ اسی لیے پوری دنیا کے مسلمان مضطرب اور بے چین ہیں، اور اسے اپنے اوپر حملہ سمجھتے ہیں۔ حکومت پاکستان کو اس معاملے کو اتنا عمومی اور سطحی طور پر نہیں لینا چاہیے کہ محض (امریکی) شمالی کمانڈ کے سربراہ کو ٹیلی فون کر کے یہ بات کہی جائے کہ جی ذرا احتیاط برتیے۔ مسئلہ بڑا سنجیدہ ہے۔ میری نگاہ میں اس معاملے میں جو کچھ ہو رہا ہے ہمیں اس کی کھل کر مذمت کرنی چاہیے۔ او آئی سی کا خصوصی اجلاس پاکستان کی تحریک پر بلایا جائے تاکہ کم از کم وزرائے خارجہ کی سطح پر بین الاقوامی دباؤ ڈالا جاسکے۔ پھر وہ وقت آگیا ہے کہ جس کے بارے میں، میں بعد میں بھی عرض کروں گا کہ امریکہ کو بھی یہ پیغام دے دیا جائے کہ بس اب بہت ہو چکا۔ جان لیجیے کہ جن ممالک نے مختلف وجوہ کی بناء پر یا دباؤ اور دھمکانے کی بناء پر آپ کا ساتھ دیا یا خاموشی اختیار کی وہ بھی اب اس کو نظر انداز نہیں کر سکیں گے۔

جناب والا! پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں دلچسپی پوری پاکستانی قوم اور امت مسلمہ کی پکار ہے۔ اس معاملے میں اگر ہماری قیادتیں بے حسی کا مظاہرہ کرتی ہیں تو وہ دنیا و آخرت دونوں میں مجرم ہوں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ سینیٹ کو کھلے الفاظ میں اس کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ مثبت اقدام کرے۔

حملہ ایک بین الاقوامی سازش ہے

جناب والا! اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ عراق پر حملہ ایک بین الاقوامی سازش ہے اور امریکہ کے اس علاقے کے بارے میں جو عزائم ہیں، ان کا آئینہ ہے۔ وقت کی کمی کی بناء پر میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا لیکن اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ ۱۹۹۲ء سے امریکی تھنک ٹینکس، پالیسی ساز، خصوصیت سے وہ فاؤنڈیشنز جن کا تعلق یہودیوں یا نئے قدامت پرستوں

(Neocons) سے ہے۔ ایک نہیں دسیوں شائع شدہ رپورٹوں میں کہہ چکے ہیں کہ عراق پر امریکہ کو جلد از فوج کشی جلد کرنی چاہیے۔ اس کی دو بنیادی وجوہ تھیں، ایک یہ کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ عراق ان ممالک میں سے ہے جو اسرائیل کے لیے کسی بھی درجے میں ایک خطرہ بن سکتے ہیں اور وہ اسرائیل سے بڑا ملک ہے، اس کے پاس وسائل اور ٹیکنالوجی کے علاوہ ایک بڑی فوج بھی ہے۔ اسرائیل کے لیے پورے خطے کو محفوظ بنانے کے علاوہ اس علاقے میں مسلمانوں کے پاس تیل کی دولت پر قبضہ ان کا ہدف ہے۔ جو وسائل عراق کے پاس ہیں، ویسے تو ان عراقی وسائل کا فائدہ امریکہ، یورپ، جاپان سب ہی اٹھا رہے ہیں لیکن اب یہ بہت حد تک ان کی گرفت میں ہیں۔ یہ ساری رپورٹس آپ دیکھ ڈالیے۔

۹/۱۱ واقعہ کا استعمال: اس کے بعد آپ پھر یہ دیکھیے کہ ۹/۱۱ کا جو حادثہ یا سانحہ ہوا اسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کس طرح استعمال کیا گیا ہے۔ Bob Woodward کی کتاب 'Bush At War' گواہ ہے کہ ۹/۱۱ کے بعد پہلا مسئلہ جو پنٹاگون کے لوگوں نے اٹھایا وہ یہ تھا کہ عراق پر حملہ کر دو۔ حالانکہ اس وقت تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ حملہ کس نے کیا ہے اور کون اس کے پیچھے ہے؟ کیا محرکات ہیں؟ لیکن نو قدامت پسندوں کی لابی بالکل تیار تھی۔ بعد ازاں Bob Woodward کی ایک اور نئی کتاب آئی ہے۔ پھر اب تو سینیٹ کی انٹیلی جینس کمیٹی، ہاؤس کی کمیٹی اور پھر ۹/۱۱ کمیشن کی رپورٹ بھی ایک ہفتہ پہلے آچکی ہے۔ ان کا مطالعہ کیجیے، میں نے ان تینوں کا مطالعہ کیا ہے. اس کے ساتھ ساتھ انگلستان سے Lord Butler کی رپورٹ اور Hunter کی رپورٹ ہے۔ ان پانچوں دستاویزات کو اگر آپ سامنے رکھیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ عراق پر حملہ کسی شہادت کے بغیر، یہ جانتے ہوئے کہ وہاں پر بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار نہیں ہیں جھوٹی بنیاد پر کیا گیا۔ وولفووٹز (Wolfowitz) نے ابھی ایک بیان میں صاف کہہ بھی دیا ہے کہ ہمیں بڑی تباہی پھیلانے والا ہتھیار اس لیے کہنا پڑا کہ یہی ایک مسئلہ تھا جس پر کہ ہم عوام کو ساتھ لے سکتے ہیں۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو گا کہ ایک ملک پر آپ حملہ کرتے ہیں، ہزاروں انسانوں

کی جانیں لے لیتے ہیں، ملک کو تباہ کر دیتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے کہ جس بات کو آپ بطور دلیل پیش کر رہے ہیں وہ جھوٹی، غلط اور بے بنیاد ہے۔

انٹیلی جنس اداروں کی ناکامی تو ۹/۱۱ سے پہلے، ۹/۱۱ کے دوران اور ۹/۱۱ کے بعد ہوئی۔ لیکن عراق کا معاملہ تو وہ ہے کہ جس میں انٹیلی جنس رپورٹس صاف ظاہر کرتی تھیں کہ ان دعووں میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد آپ دیکھیں کہ امریکہ نے کوشش کی کہ اقوام متحدہ اس کا ساتھ دے۔ لیکن اقوام متحدہ نے ساتھ نہیں دیا اور اس طرح اقوام متحدہ کو مکمل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے بعد پھر یہ کہا گیا کہ عراقی اپوزیشن عراق میں ہمارا استقبال کرے گی اور عراقی عوام ہم پر پھول نچھاور کریں گے، لیکن ہوا کیا ہے؟

سازش کے خلاف عراقی عوام کی مزاحمت

حقیقت یہ ہے کہ عراقی عوام نے اپنی جان کی بازی لگا کر اپنی عزت، آزادی اور ایمان کی خاطر مقابلہ کیا ہے اور ان کی یہ مزاحمت محض شیعہ سنی کی مزاحمت نہیں۔ یہ عوامی مزاحمت ہے۔ امریکہ نے پوری کوشش کی ہے کہ وہاں شیعہ اور کرد اور عرب آپس میں لڑائے جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف نسلی بنیادوں پر تصادم ہو لیکن میں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں عراقی عوام کو کہ انہوں نے امریکہ کی ہر سازش کو ناکام کیا ہے۔ سب متحد ہو کر امریکہ کو قابض فوج اور ایک سامراجی طاقت جان کر اس کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ابو غرائب جیل کے حقائق آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ لیکن وہاں ایک ابو غرائب نہیں ہے ایسی کم از کم ۶ جیلیں اور موجود ہیں۔ امریکہ ہی نہیں بلکہ برطانیہ کی افواج نے بھی اسی نہج کے مظالم کیے ہیں۔ ان تمام چیزوں کے باوجود عراقی عوام نے قومی مزاحمت دکھائی۔ ابھی حال ہی میں چار پانچ دن پہلے International Herald Tribune میں جو مضمون آیا ہے، اس میں مضمون نگار نے یہ بات صاف صاف کہی ہے کہ ہم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ عراق کے عوام ہی نہیں سارے عالم عرب اور عالم اسلام کے عوام ہمارے خلاف

ہیں۔ عراق میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کوئی دہشت گرد گروہ، یا کسی منفرد گروہ کا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ پوری قوم کی مزاحمت ہے۔ ایک اور مضمون نگار نے Herald Tribune ہی میں بش کو مشورہ دیا ہے کہ ذرا انٹیلی جنس رپورٹس کو پڑھنا چھوڑ دو اور الجزیرہ کو سنو تاکہ تمہیں معلوم ہو سکے کہ تمہاری سوچ اور مشرق وسطیٰ کے عوام کی سوچ میں کتنا فرق ہے؟

جناب والا! میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عراق پر حملہ ناجائز اور ظالمانہ ہے۔ یہ قبضہ استعماری اور غاصبانہ قبضہ ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے اپنی ساری کمزوریوں اور امریکہ کے بارے میں مداہنت کے باوجود امریکہ کو وہاں پر ایک قابض فوج تسلیم کیا ہے۔ جو ڈرامہ عارضی حکومت کا رچایا گیا ہے اس کی حقیقت بھی سب کو معلوم ہے۔ عراقی وزیر اعظم کا سی آئی اے سے کیا تعلق تھا اور ہے؟ وزیر اعظم کے احکامات کون مان رہا ہے اور اصل قوت اس وقت کس کے پاس ہے؟ یہ سب کچھ واضح ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت صرف امریکی افواج ہی وہاں پر تمام نظام چلا رہی ہیں۔

حملہ کے مضمرات

جناب والا! میں واضح کر دوں کہ یہ نکتہ محض اعتراض کا نہیں ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ خطرہ دنیا کے ہر ملک کو ہے کہ جو کچھ امریکہ نے افغانستان میں کیا اور پھر عراق میں کیا اور اس کے ساتھ ساتھ شمالی کوریا اور ایران کو جس طرح نشانہ بنایا جا رہا ہے یہ علیحدہ علیحدہ واقعات نہیں ہیں، یہ ایک استعماری سوچ کا حصہ ہیں۔ پاکستان میں ہمیں زیادہ خوش نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ بلاشبہ وہ کہتے ہیں کہ واہ واہ پاکستان نے ہمارا کیا ساتھ دیا ہے کہ ہزاروں افراد اپنے ملک میں پکڑنے کے علاوہ ۶۰۰ کے قریب ہمیں بھی دے دیے لیکن یہ سلسلہ رکنے والا نہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ امریکہ کے حوالہ کیے گئے ان ۶۰۰ پاکستانیوں میں سے کتنوں پر کوئی جرم ثابت ہوا ہے؟ کوئی مقدمہ دائر ہوا ہے؟ یا کوئی چارج شیٹ لگی ہے؟ کیا کوئی شہادت ان کے خلاف ہے؟ لیکن جناب والا! ان سب کے باوجود

کوئی ایک بھی بیان یا تحریر ایسی سامنے نہیں آئی جو ان لوگوں کے خلاف پیش کی جا سکے۔

میں بغور تمام چیزوں کا مطالعہ کر رہا ہوں کہ بلیک میلنگ اور دھمکانا کہ 'مزید کرو' (Do more) اور جو ہم کہتے ہیں وہ مانو، اسی کی گردان ہو رہی ہے۔ یوں ان ساری کی ساری چیزوں کے اندر ایک خاص طریقہ ہے۔ اگر ہمارا دفتر خارجہ، ہمارے صدر اور ہماری کابینہ اس پیٹرن کو نہیں دیکھ رہی ہے تو میں بڑے ادب سے درخواست کروں گا کہ خدا کے لیے آپ نے آنکھوں پر جو چشمہ لگا رکھا ہے وہ اتاریئے اور دیکھیے کہ کیا ہو رہا ہے؟

جناب چیئرمین! مغربی دنیا سے شائع ہونے والے ذرائع ابلاغ میں کوئی ایک اداریہ ایسا نہیں ہے جس میں پاکستان کے بارے میں دو جملے تعریف کے کہنے کے بعد دو پیراگراف اس پر نہ ہوں کہ یہ اور یہ کرو ورنہ تم دہشت گرد قرار دیئے جاؤ گے۔ درحقیقت یہ سارا کا سارا ایک کھیل ہے۔ عراق کا مسئلہ صرف عراق کا مسئلہ نہیں ہے فی الاصل آج سارا عالم اسلام خاص طور پر خطرے میں ہے۔ اگر خدانخواستہ امریکہ عراق میں جنگ جیت جاتا ہے تو مسلم دنیا میں کسی کی خیر نہیں اور اگر وہ عراق میں منہ کالا کر کے واپس جاتا ہے تو اس کے بعد بہت سی رکاوٹیں ضرور پیدا ہو جائیں گی اگرچہ امریکی عزائم بہرحال نہیں بدلیں گے۔

تو آج عراق اور اس کے شہروں نجف اور بغداد میں جو لڑائی لڑی جا رہی ہے وہ دراصل پورے عالم اسلام کی لڑائی ہے۔ میں اس سے آگے بڑھ کر یہ کہوں گا کہ وہ تیسری دنیا اور تمام مظلوم قوتوں کی لڑائی ہے۔ اگر ایک مرتبہ ایک ظالم اور جابر کو اس طریقے سے اپنا تسلط قائم کرنے کا موقع مل گیا تو پھر کسی کی خیر نہیں۔ خدا کے لیے آنکھیں کھولیے۔ اس خول سے نکلیے کہ عراق کوئی دور دراز کی چیز ہے اور یوں آپ کھل کر مذمت کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ اگر ہم اس کے لیے کہتے ہیں تو آپ کہتے ہیں مذمت نہ کرو درگزر کر دو۔ یہ رویہ ختم ہونا چاہیے۔

تیسرا پہلو جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ دراصل ایک وسیع تر مسئلے کا ایک حصہ ہے اور وہ حصہ سمجھنے کے لیے مفید ہو گا کہ آپ ۹/۱۱ رپورٹ کا مطالعہ کریں۔ خصوصیت سے اس کا پہلا باب اور اس کے بعد حکمت عملی کے آخری دو ابواب۔ آنکھیں کھولنے کے لیے ان کا مطالعہ اور تجزیہ بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ امریکہ کو اگر خطرہ ہے تو دہشت گردی سے نہیں۔ دہشت گردی کی تو کتنی ہی شکلیں ہیں۔ خود امریکہ میں بہت سے دہشت گرد گروپ موجود ہیں اور کم از کم گیارہ بارہ دہشت گرد تحریکیں امریکہ میں کام کر رہی ہیں۔ لیکن اصل خطرہ ان سے نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اصل خطرہ اسلامی دہشت گردی سے ہے۔ اور پھر کہتے ہیں اسلامی دہشت گردی سے نہیں بلکہ اس فکر اور بنیادی ڈھانچے سے ہے جو مسلمانوں میں مدافعت اور مزاحمت کی ذہنیت پیدا کرتا ہے۔ اس میں وہ یہ کہتے ہیں کہ مدرسے، دیگر دینی ادارے اور دینی روایات، یہ پورا بنیادی ڈھانچہ ہے جسے ختم کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ جب تک اس بنیادی ڈھانچے کو تباہ نہیں کر دیا جائے گا امریکہ محفوظ نہیں ہو گا۔ لیکن! بات صرف اتنی بھی نہیں ہے۔ اس سے آگے بڑھیے!

سی آئی اے افسر کا تجزیہ

جناب والا! ایک بڑی چشم کشا کتاب ابھی دو مہینے پہلے آئی ہے 'Imperial Hubris' جس کا لکھنے والا گمنام ہے لیکن آپ کو بتا دوں کہ یہ گمنام کون ہے؟ یہ گمنام سی آئی اے کا ایک سینئر تجزیہ کار افسر ہے[1] اس نے اپنے پیش لفظ میں یہ لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کو CIA سے کلیئر کروا لیا ہے۔ البتہ پابندی صرف اتنی ہے کہ اپنا نام نہ ظاہر کروں۔ یہ کتاب شائع ہو گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ آج ساری دنیا خصوصیت سے عالم اسلام امریکہ کے خلاف ابھر رہا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے اس کو ماننا چاہیے۔ پھر

---

[1] بعد میں اس افسر کا نام بھی ظاہر کر دیا گیا ہے۔ Michael Scheuer نامی اس افسر نے ۲۲ سال سی آئی اے کے لیے کام کیا جس کے دوران ۱۹۹۶-۱۹۹۹ء وہ 'انسداد دہشت گردی' کے مرکز کے بن لادن اسٹیشن کا ذمہ دار بھی رہا۔

وہ کہتا ہے کہ اگر یہ ایک حقیقت ہے تو اس کے اثرات کیا ہیں؟ یہاں میں اس کو داد دیتا ہوں کہ اس نے کھل کر یہ بات کہی ہے کہ یہ مسئلہ محض سیاسی مفاد کا نہیں بلکہ اس کی حقیقی وجوہات ہیں اور ان وجوہات میں مخالفت امریکہ سے نہیں، امریکہ کی پالیسیوں سے ہے۔ اور یہ پالیسیاں کیا ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ اس پالیسی میں سر فہرست فلسطین کا مسئلہ، اسرائیل کے بارے میں ہمارا رویہ اور کلی طور پر اپنے آپ کو اسرائیل سے منسلک کر دینا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ افغانستان اور عراق میں ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کا پیغام پوری دنیا خصوصیت سے مسلم دنیا میں پہنچا ہے۔

اسی تسلسل میں وہ کہتا ہے کہ تیسری چیز یہ ہے کہ انہیں (مسلمانوں کو) یہ خیال ہے کہ امریکہ ان کے وسائل، خصوصیت سے تیل پر قبضہ کر رہا ہے۔ اس طرح سے اس نے چھ نکات بتلائے ہیں کہ یہ چھ بنیادی چیزیں ہیں جس کی بنا پر آج عالم اسلام ہماری مخالفت میں ہے۔ امریکہ کو اب کیا کرنا چاہیے۔ اس کے جواب میں وہ کہتا ہے چار راستے ہو سکتے ہیں۔ پہلا راستہ یہ ہے کہ ہم دہشت گردوں اور جو ان کو پناہ دیں، ان کو تباہ کر دیں۔ اور یہی وہ راستہ ہے، یہ وہ پالیسی ہے جو موجودہ امریکی حکومت نے اختیار کی ہوئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ دنیا میں کہیں بھی محض قوت کے ذریعے اس نوعیت کے خطرات کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم ایک کے بعد دوسرے ملک پر قبضہ کر لیں گے۔ لیکن دہشت گردی ختم نہیں ہو گی۔ پھر کیا کیا جائے؟ پھر کہتا ہے کہ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم اپنی پالیسی کو بدل لیں۔

جناب چیئرمین! میں آپ کو اور دفتر خارجہ کو دعوت دوں گا کہ جو اس کا ردعمل ہے، اس پر غور کریں۔ وہ کہتا ہے کہ اصل حل تو یہی ہے لیکن ہم یہ کر نہیں سکتے اور نہ ہمیں یہ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ امریکہ کی جو سیاسی حقیقتیں ہیں اور جو ہمارے مفادات ہیں ان کی بنا پر ہم یہ پالیسی نہیں بنا سکتے۔ یہ بات کہتے ہوئے کہ پھر کیا راستہ ہے؟ تیسری بات وہ یہ کہتا ہے کہ پھر اس کا راستہ یہ ہے کہ ہم قومی تعمیر کا راستہ اختیار کریں۔ یعنی یہ کہ ہم ان تمام ممالک میں ایک

طرف تو دہشت گردی کے خلاف یا اس کے نام پر جس کو بھی نشانہ بنائیں اس کو ہم ہدف بنائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم وہاں پر اپنے ہمنوا پیدا کریں۔ وہاں پر حکومتوں میں اعتدال پسند تلاش کریں۔ تعلیم، عوامی سطح پر سفارت کاری، حکومتوں کی تبدیلی یہ وہ ساری چیزیں ہیں، سارے وسائل ہمارے سامنے ہونے چاہییں تاکہ ان تمام ممالک کے اندر قومی تعمیر اس طریقے سے ہو کہ وہ ہماری زنجیروں کو زیور سمجھ کر قبول کر لیں۔ چوتھی بات وہ یہ کہتا ہے کہ جو ہماری بات کو نہ مانیں ان کو برابر سزا دیں۔ تو تعزیر اور نام نہاد قومی تعمیر یہ ہے وہ حکمت عملی۔

رینڈکارپوریشن کی رپورٹ: اسی طرح جناب چیئرمین! آپ دیکھیں تو Rand Corporation کی جو رپورٹ ابھی آئی ہے وہ بھی اسی لائن کے اوپر ہے۔ اگرچہ وہ کسی قدر معتدل ہے۔ اس میں انہوں نے کہا ہے کہ مسلم ممالک میں صرف چار عناصر ہیں۔ ایک جنہیں وہ بنیاد پرست کہتے ہیں جو اپنی آزادی اور ایمان کے تحفظ کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہیں، یہ ان کی نگاہ میں بنیاد پرست بن جاتے ہیں، دوسرے قدامت پرست، تیسرے لبرلز اور چوتھے لادین۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اصل حلیف لادین ہیں لیکن لبرلز کا بھی دھیان رکھنا چاہیے، قدامت پرستوں کو گوارا کر لیں۔ سب سے پہلے بنیاد پرستوں سے نمٹ لیں، انہیں بالکل ختم کر لیں تو پھر قدامت پرستوں اور ان کے بعد لبرلز سے نمٹیں۔ رپورٹ کے مطابق دراصل جب تک مسلم دنیا میں لادینی نظام نہیں آئے گا اس وقت تک یہاں کے حالات نہیں بدلیں گے۔ یہ سوچ اس سے پہلے بھی تھی، یہ نئی چیز نہیں ہے۔ ہر سامراجی قوت نے یہ سوچا ہے۔ برطانیہ کے حکمت کاروں کی اگر آپ چیزیں پڑھیں، میں نے ان کا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے آج سے دو سو سال پہلے بھی یہی بات کہی تھی۔ جہاد کو آج ہدف بنایا جا رہا ہے لیکن جہاد کو ہدف بنانا آج نہیں، ماضی میں بھی کیا جاتا رہا ہے۔

مستشرقین کی پوری حکمت عملی دیکھ لیجیے، سامراجی حکمرانوں کی تقریریں دیکھ لیجیے، ہر جگہ جہاد ہی کی قوتوں نے سامراج کا مقابلہ کیا اور ہر جگہ جہاد کو مسئلہ بنایا گیا حتیٰ کہ جہاد کی

تضحیک کی گئی۔ یہ سب مراحل تھے۔ ہم اس سے گزر چکے ہیں۔ جہاد اللہ کا حکم ہے، قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ جب تک قران موجود ہے اور ان شاء اللہ یہ موجود رہے گا، جہاد کو اسلام سے کوئی نہیں نکال سکتا ہے اور جہاد کے بغیر مسلمان عزت، ایمان کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ ٹھیک ہے جہاد اور دہشت گردی ایک چیز نہیں ہے۔ اس کے آداب ہیں لیکن جہاد کے بارے میں یہ سمجھنا کہ جہاد کو ختم کر کے وہ مسلمانوں کو اس طریقے سے ناکارہ بنا سکتے ہیں۔ ؏

ایں خیال است و محال است و جنوں است

تو یہ وہ تیسرا پہلو ہے۔ پہلا فوری، جذباتی اور ایمانی مسئلہ ہے کہ جو کچھ وہاں ہو رہا ہے انسانی مسئلہ ہے۔ ہمیں اس کو اٹھانا چاہیے، احتجاج کرنا چاہیے، اس کے خلاف متحرک ہونا چاہیے اور اس طرح خاموش بیٹھے رہنا یا ایک آدھ ٹیلی فون کر دینا اور ایک آدھ بیان دے دینا، یہ کافی نہیں ہے۔

دوسری بات عراق کا مسئلہ سیدھا سیدھا غاصبانہ قبضہ ہے، جدید سامراج ہے اور مشرق وسطیٰ کے نقشے کو بدلنے کا منصوبہ ہے لیکن تیسرا اس سے زیادہ بڑا خطرہ یہ ہے کہ اس کو عنوان بنا کر مسلم دنیا میں ایک تہذیبی کشمکش اور لبرلز اور قدامت پرستوں کا تصادم مطلوب ہے۔ امریکی وسائل، امریکی میڈیا اور اس کے ساتھ ساتھ یورپی میڈیا ان سب کے ذریعے اس بات کی کوشش ہے، جسے وہ قومی تعمیر کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو ان کی جڑوں اور بنیادوں سے ہلا دیں، اور ان کو محض اپنی آواز بازگشت اور اپنا ذہنی غلام یا نوکر چاکر بنا دیں۔ یہ ہے وہ کھیل، جناب والا! اگر ہم اس خطرے کا بھرپور مقابلہ نہیں کرتے تو مجھے ڈر ہے کہ ہماری آزادی اور ایمان دونوں خطرے میں ہیں۔

وقت کا تقاضا: قومی و ملی اتحاد

میں امریکہ کو الزام نہیں دیتا اس لیے کہ امریکہ کا جو بھی ذہن ہے یا جو ان کے عزائم ہیں، وہ اس کے مطابق کر رہے ہیں۔ البتہ میں اپنے حکمرانوں سے اپیل کرتا ہوں، اور اپنی قوم

اور اس کے تمام عناصر سے کہ ہمارے اختلافات بھی ہوسکتے ہیں اور ہیں لیکن ہماری آزادی، ہمارا دین و ایمان اور روایات یہ سب کے لیے محترم ہیں اور ہمیں ان کے دفاع کے کے لیے منظم ہونے کی ضرورت ہے، مل کر چلنے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے صحیح کہا تھا کہ ؎

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو گلہ تو تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے!

تو یہ جو نام نہاد 'قومی تعمیر' کی یلغار ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں متحد ہونے کی ضرورت ہے۔ جناب والا! میں یہ صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس کا مقابلہ محض قوت کے اندھے استعمال یا ایسے کسی اقدام سے نہیں ہو سکتا جو محاذ آرائی کو بڑھانے والے ہوں۔ یہ راستہ نہیں ہے، راستہ ہے جمہوری بنیادوں کے اوپر اپنی آزادی کے تحفظ کا۔ راستہ ہے پاکستان کے دستور کا، اس کی تمام دفعات کے ساتھ احترام، جمہوری روایات کے فروغ، اداروں کا استحکام اور مل جل کر مشورے سے ایک حکمت عملی بنانے کا۔

میں اس پر حکومت کو بھی دعوت دیتا ہوں اور اپنی طرف سے اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ ہر وہ اقدام جو پاکستان کی آزادی، اسلامی قوتوں کی تقویت اور جدید امریکی استعمار کی مزاحمت کرنے کے لیے ایک حقیقت پسندانہ حکمت عملی کے ساتھ تیار کریں گے ہم اس میں تعاون کریں گے۔ لیکن راستہ یہی ہے کہ اٹھیے اور چیلنج کو محسوس کیجیے۔ اس کو نظر انداز کرنا، ایسا ہی ہے جیسے کہ بلی کے حملہ کرنے پر کبوتر آنکھیں بند کرلے۔ یہ راستہ نہیں ہے۔ راستہ یہی ہے کہ آنکھیں کھول کر کہ مقابلے کی تیاری کی جائے اور مجھے یقین ہے کہ امت مسلمہ اپنے میں یہ طاقت اور قوت رکھتی ہے۔ امریکہ بڑی طاقت ضرور ہے لیکن اللہ سب سے بڑی قوت ہے اور ایک نہیں تاریخ میں کم از کم ۳۶ سپر پاورز کے قبرستان موجود ہیں۔ ہمیں خائف نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے اپنے زمانے میں دیکھا ہے کہ برطانیہ اور روس سپر پاور تھے لیکن اب ان کی حیثیت کیا ہے۔ مرعوب نہ ہو جایئے۔ اپنی حقیقت اور قوت کو پہچانیے، ان شاء اللہ مستقبل ہمارے ساتھ ہو گا۔ (۲۳ اگست ۲۰۰۴ء)

عراق کے خلاف جنگ پر سینیٹ کی قرار داد

جناب چیئرمین! سب سے پہلے میں دل کی گہرائیوں سے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ جو عظیم ذمہ داری آپ کے شانوں پر اس ایوان نے اور قوم نے ڈالی ہے، آپ اس سے انتہائی خوبصورتی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں، میں اس پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور آپ کے لیے دعا کرتا ہوں۔

آج میری نگاہ میں یہ ایک تاریخی موقع ہے کہ اپنے تمام سیاسی اختلافات کے باجود حزب اختلاف اور حزب اقتدار دونوں نے ایک ایسے مسئلے پر جو پوری انسانیت کے لیے ایک بہت بڑا امتحان اور آزمائش ہے، ہم آواز ہو کر بات کی ہے۔ ایک ایسی صورت حال جس میں ایک جارح قوت نے مجبور اور مظلوم انسانوں پر بے پناہ مظالم کیے ہیں، خون بہایا ہے اور اس سے ایک عالمگیر مسئلہ پیدا ہو گیا ہے اس پر کھل کر بات کی ہے۔ ایک ایسی جنگ جس کے نتیجے میں بڑے اہم اور بین الاقوامی معاملات کے بارے میں قواعد و ضوابط، روایت، قانون اور چارٹر سے متعلق مسائل پیدا ہو گئے ہیں اس پر اس ایوان کی تمام جماعتوں نے پوری آزادی، دیانت اور جرأت کے ساتھ اپنے اپنے نقطۂ نظر کو بیان کیا ہے۔ ہر نقطۂ نظر میں ایک وزن ہے، اس کا ایک مقام ہے۔ اسی رواداری، اخوت، بھائی چارے، جمہوریت اور پارلیمانی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے مشترکہ قدریں نکلتی ہیں، اس قدر مشترک پر اتفاق رائے پیدا کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے یہ بڑی اچھی مثال ہے اور مستقبل کے لیے ایک اچھی روایت ہے۔ میں اس معاملے میں اپنے تمام ساتھیوں، اپوزیشن کی تمام جماعتوں اور حکومت اور اس کی اتحادی تمام پارٹیوں کو قابل مبارک باد سمجھتا ہوں۔ ان کی کوششوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ اپنے لیے اس بات کو ایک اعزاز سمجھتا ہوں کہ اپوزیشن کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ موقع دیا گیا کہ میں متفقہ قرار داد آپ کے سامنے پیش کروں۔

جناب والا! میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہم میں سے کچھ ارکان اس قرار داد میں

شاید اس سے کہیں زیادہ سخت الفاظ چاہتے ہیں اور کچھ اس سے زیادہ نرم چاہتے ہیں۔ لیکن یہ جمہوریت کی برکت اور مشاورت کا ثمرہ ہے کہ ہم نے مل جل کر، تین دن لگا کر ایک ایسا بیانیہ پیش کیا ہے جو الفاظ کے مقابلے میں اپنے پیغام کے اعتبار سے بڑا اہم ہے۔ اس لیے میں چاہوں گا کہ محض الفاظ پر آپ نہ الجھیں بلکہ جو پیغام ہم دینا چاہتے ہیں، اس پر توجہ دیں۔ وہ پیغام پاکستان کی پوری قوم کا پیغام ہے، وہ اس ایوان اور اس ایوان کے تمام ارکان کا پیغام ہے۔ یہ پیغام خود اپنے لیے بھی ہے اور پوری دنیا کے لیے بھی ہے۔ ہماری اصل توجہ اس پیغام پر ہونی چاہیے۔ میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ تجزیہ کریں گے تو پوری بحث میں پانچ نکات متفقہ علیہ طور پر سامنے آئے ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ جنگ یک طرفہ اور اقوام متحدہ کے چارٹر کے خلاف ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس جنگ میں عراق کے معصوم اور نہتے عوام پر اندھا دھند بمباری کی جارہی ہے، اور بلا امتیاز ان کا خون بہایا جارہا ہے۔

تیسری چیز یہ کہ اقوام متحدہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا کردار ادا کرے۔ جنگ کو رکوائے۔ درحقیقت فوری طور پر جنگ کو رکوانا وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

چوتھی چیز یہ کہ ساری دنیا کے عوام اور بہت سے ممالک کی حکومتوں نے بھی احتجاج کیا ہے۔ یہ احتجاج ایک نئی عالمی رو کا مظہر ہے اور ہم اس کا حصہ ہیں۔ ہم اس کی تائید کرتے ہیں اور اس کی تقویت کے خواہشمند ہیں۔

آخری چیز یہ کہ ہم سب عراق کے عوام کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم ان کے غم اور دکھ اور ان کی تکالیف میں بھی شریک ہیں۔

یہ وہ پانچ پیغامات ہیں جو آپ کی تمام بحثوں کے قدر مشترک ہیں اور اسی کو ہم نے اس قرارداد میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ انہی الفاظ کے ساتھ جناب، میں قواعد کے مطابق یہ قرارداد پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔

سینیٹ آف پاکستان کے رولز آف پروسیجر اینڈ کنڈکٹ آف بزنس ۱۹۸۸ء کے رول ۱۹۴ کے تحت میری (پروفیسر خورشید احمد) اپنی جانب سے اور میاں رضا ربانی، مولانا سمیع الحق، جناب ثناء اللہ بلوچ، جناب ایس ایم ظفر (جو تحریک پیش کرنے والے رکن ہیں)، جناب دلاور عباس، جناب محمد علی درانی، جناب عبدالرزاق تھہیم، انیسہ زیب طاہر خیلی، سینیٹر گلشن سعید، ڈاکٹر شہزاد وسیم، چوہدری ایم انور بھنڈر، جناب سعید احمد ہاشمی، پروفیسر غفور احمد، جناب صفدر علی عباسی، جناب رضاایم رضا، پروفیسر محمد سعید صدیقی، مولانا گل نصیب خان، جناب محمد اسحٰق ڈار، جناب محمد اسماعیل بلیدی، جناب امان اللہ کنرانی اور جناب اسفند یارولی کی جانب سے سینیٹ آف پاکستان کی منظوری کے لیے اس قرارداد کو پیش کرنے کا اعزاز حاصل کررہاہوں۔

سینیٹ آف پاکستان عراق کے خلاف اقوام متحدہ کے چارٹر کی واضح خلاف ورزی کرتے ہوئے امریکہ، برطانیہ اور اتحادی افواج کے حملے پر صدمے اور مایوسی کا اظہار کرتی ہے۔ سینیٹ عراق کے خلاف فوجی حملے میں معصوم عراقی شہریوں کے خلاف بلاامتیاز فائرپاور کے استعمال پر شدید افسوس کااظہار کرتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل ان پر تشدد حملوں کو روکنے کے لیے لازماً فوری اقدامات کرے اور مسئلے کا پرامن اور فوری حل تلاش کرے۔ سینیٹ امن سے محبت کرنے والے دنیا کے تمام ممالک کے اس جنگ کے خلاف احتجاج کی حمایت کرتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ اس جنگ میں ملوث ممالک کو جنگی کارروائیاں فوری طور پر بند کرنے کی خاطر ہر طرح سے دباؤ ڈالنے ک لیے عالمی رائے عامہ کو متحرک کیا جائے۔ سینیٹ آف پاکستان عراقی عوام کے ساتھ اپنی یکجہتی کااظہار کرتی ہے۔ جناب چیئرمین! میں اس قرارداد کی منظوری کی درخواست کرتاہوں۔ (۲۔ اپریل ۲۰۰۳ء)

عراق میں قابض فوجیوں کے مظالم

جناب چیئرمین! میں اپنی بہن سینیٹر سعدیہ عباسی صاحبہ کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے عراق کی جیلوں میں قابض فوجیوں کے مظالم کے مسئلہ کی طرف توجہ دلائی۔ میں

نے بھی بی بی سی پر خبریں سنیں اور چند تصاویر دیکھی ہیں۔ حقیقت ہے کہ ان تصاویر کا دیکھنا بھی ایک انسان کے لیے سزا کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک طرف یہ ممالک ہیں جو تہذیبوں کی علم برداری، آزادی کے تحفظ، حقوق انسانیت اور دنیا میں جمہوریت کے فروغ کے دعوے کرتے ہیں اور دوسری طرف بنیادی انسانی اقدار ہیں جنہیں یہی ممالک بے دردی سے اور انتہائی شرم ناک انداز میں پامال کر رہے ہیں۔

جناب والا! ابو غرائب کے واقعات جب سامنے آئے تو فطری طور پر پوری دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ چنانچہ جان بوجھ کر اس بات کی کوشش کی گئی کہ جو تصاویر اور فلمیں اس کے متعلق دستیاب ہو گئی تھیں انہیں دبا دیا جائے۔ آزادی رائے اور آزادی صحافت کے یہ وعظ ہمیں سنانے والے کہتے ہیں کہ ہماری یہ اقدار نا قابل مصالحت ہیں۔ لیکن اس معاملے میں جب چند تصاویر سامنے آئیں اور ان پر تہلکہ مچا تو امریکہ کی حکومت کی جانب سے ان تمام شہادتوں کو چھپایا گیا۔ میں پھر یہ بات کہوں گا کہ بہر حال یہ جمہوری ممالک کی ایک خوبی بھی ہے کہ وہاں اطلاعات کی آزادی کا قانون ہے۔ چنانچہ اس قانون کی بنیاد پر مسلسل کوشش کر کے عدالتوں کی مدد سے ان شہادتوں کو حاصل کیا گیا ہے لیکن آج بھی ان تصاویر کو امریکہ کے میڈیا پر نہیں دکھایا جا رہا ہے۔ البتہ آسٹریلیا جو اتحاد کا حصہ ہے اور جس نے اپنی فوجیں بھی عراق میں بھیجی ہیں، انہوں نے وہاں اپنے ٹی وی پر کل ڈیٹ لائن پروگرام میں چالیس تصاویر دکھائی ہیں۔ اس سے پہلے ان قیدیوں کی جو تصاویر آئی تھیں، در حقیقت انہیں بیان کرنا بھی مشکل ہے۔ یعنی واضح طور پر لوگوں کو ذبح کیا جا رہا ہے، برہنہ کر کے الٹا لٹکایا جا رہا ہے اور ان پر کتے چھوڑے جا رہے ہیں۔ بعض تصاویر میں برہنہ افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھا جا رہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی عام انسان کے لیے ان تصاویر کو دیکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ یہ مظالم ہو رہے ہیں اور مہذب دنیا کے جو سرخیل ہیں، ان کی طرف سے ہو رہے ہیں۔ جناب والا! اس پر اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کمیٹی نے احتجاج کیا ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے احتجاج کیا ہے۔ جناب والا! مجھے آپ اجازت دیں کہ میں اس پر آپ کو صرف

ایک جملہ سناؤں جو خود اس پروگرام کے پروڈیوسر نے کہا:

''اسے ابوغرائب جیل کی ان تصاویر کو جو خوف وہراس اور بدسلوکی سے بھری ہوئی تھیں دیکھ کر دھچکا لگا''۔

جناب والا! یہ ایسی چیز ہے جس پر ہمیں اپنے شدید غم وغصے کا اظہار کرنا چاہیے اور میں یہ بات بڑے تحسین کے جذبات کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ جب میں نے قائد ایوان کے ساتھ اس مسئلے پر بات کی تو انہوں نے بھی اس سے اتفاق کیا کہ اس پر ہمیں اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہم اس پر ایک مشترکہ قرارداد لا رہے ہیں۔ جناب والا! ہم نے اس قرارداد کے مسودہ پر آپس میں اتفاق کر لیا ہے اور وسیم سجاد صاحب، میرے اور میری بہن سعدیہ عباسی کی طرف سے یہ مشترکہ قرارداد پیش کریں گے۔

قرارداد کا متن

قائد ایوان وسیم سجاد نے اس قرارداد کو پڑھ کر سنایا جس پر اپوزیشن لیڈر رضا ربانی، مسلم لیگ (ن) کے سینیٹرز اسحٰق ڈار اور سعدیہ عباسی اور ایم ایم اے کے پروفیسر خورشید احمد نے دستخط کیے۔ قرارداد میں کہا گیا کہ: سینیٹ آف پاکستان نے عراق میں ابوغرائب جیل میں قیدیوں پر قابض فوج کے مظالم پر اپنے صدمے اور شدید مایوسی کا اظہار کیا ہے جس کے ثبوت آسٹریلیائی ٹی وی پر اپنے 'ڈیٹ لائن' پروگرام میں دکھائی گئی تصاویر میں موجود ہیں۔ ان توہین آمیز تصویروں کو امریکہ میں شائع کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ سینیٹ انسانیت کے خلاف ان جرائم کی مذمت کرتی ہے اور اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کمیٹی اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کی طرف سے ان جرائم کے ذمہ دار تمام افراد کو سزا دینے اور عراق، گوانتاناموبے اور دیگر مقامات پر جہاں جنگی قیدیوں کو رکھا گیا ہے، جنیوا کنونشنوں کی مکمل پابندی کو یقینی بنانے کے مطالبات کی حمایت کرتی ہے۔ (۱۶ فروری ۲۰۰۶ء)

توہین رسالتؐ پر مبنی خاکوں کی اشاعت اور احتجاج

جناب چیئرمین! میں اس وقت یورپ میں نبی پاک ﷺ کی ذات مبارکہ کے بارے میں جو شیطانی اور نہایت گھناؤنی مہم کارٹون کے ذریعے سے چل رہی ہے، اس سے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس نفرت انگیز مہم پر پوری مسلم امہ احتجاج کر رہی ہے۔ پاکستان کے لیے اور بالخصوص اس ایوان کے لیے اس کا نوٹس لینا از حد ضروری ہے۔ جناب والا! یہ ایک سوچی سمجھی سازش اور منظم کوشش ہے جس کا آغاز نائن الیون کے بعد ہو گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب اسی کے تسلسل میں یورپ میں پچھلے چھ مہینے سے بہت ہی منظم انداز میں اسلام، مسلمان، قرآن پاک اور پھر اب نبی پاک ﷺ کی ذات مقدس کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ صرف ڈنمارک میں ان چھ مہینوں کے دوران میں ایک درجن سے زیادہ بار اس طرح کی کوششیں کی گئی ہیں[1]۔

کیا واقعہ اتفاقی ہے؟

اس ضمن میں سب سے زیادہ قابلِ گرفت اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ حالیہ واقعہ کسی بھی طرح کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے۔ آپ دیکھیے کہ لیموندے (Le Monde) کھلے طور پر اداریہ میں یہ کہتا ہے کہ مذہب محض چند خیالات کا مجموعہ ہے اور ہمیں اس بات کا حق ہے کہ نہ صرف مذہب کے بارے میں بات کریں اور اس پر تنقید کریں بلکہ مذاق بھی

---

[1] زیر بحث نفرت انگیز مہم کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب ڈنمارک کے اخبار Jyllands-Posten کی جانب سے ۳۰ ستمبر ۲۰۰۵ء کو ۱۲ توہین آمیز کارٹون شائع کیے گئے تھے۔

اڑائیں۔ ڈنمارک کے جس پرچے میں کارٹون شائع کیے گئے ہیں اس نے ایڈیٹوریل میں یہ بات لکھی ہے کہ ہم نے دس بارہ آرٹسٹوں کو باقاعدہ مدعو کیا کہ وہ اسلام اور نبی پاک ﷺ کے بارے میں کارٹون بنائیں۔ اس مجموعی پس منظر میں ہی آج کے ''دی نیشن'' میں ڈاکٹر شیریں مزاری کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے پچھلے چھ مہینے کا پورا جائزہ لیا ہے کہ کس منظم طریقے سے مسلم دنیا کو ٹارگٹ کیا گیا ہے۔

آزادی اظہار کی حدود: جناب والا! میں آزادی صحافت اور آزادی رائے کا قائل ہوں۔ اسلام نے یہ آزادی ہر انسان کو دی ہے۔ حتٰی کہ اسلام نے یہ آزادی بھی انسانوں کو دی ہے کہ وہ اس زمین و آسمان کے خالق و مالک اور آقا کے وجود کا انکار کر دیں۔ اسلام غیر مسلم کو بھی زندہ رہنے کا اتنا ہی حق دیتا ہے جتنا مسلمان کو حاصل ہے۔ اور ساتھ ہی اسلام نے یہ بھی کہا ہے کہ ''جھوٹے خداؤں کو بھی برا مت کہو'' اس لیے کہ چاہے جھوٹے خدا ہوں لیکن اگر کچھ لوگ ان کو صحیح سمجھتے ہیں تو ان کے جذبات کا احترام بھی ضروری ہے۔ چنانچہ آزادی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دوسروں کی توہین، تذلیل اور یا تحقیر کریں۔ اس پس منظر میں آزادی کی حدود کا تعین ضروری ہے۔ اِمانویل کانٹ (Immanuel Kant) مشہور جرمن فلاسفر نے آزادی کی بڑی پیاری تعریف کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ مجھے اختیار ہے کہ جب میں چل رہا ہوں تو اپنا ہاتھ ہلاؤں لیکن میرے گھونسے کی آزادی کی حدود وہاں ختم ہو جائے گی جہاں سے آپ کی ناک شروع ہوتی ہے۔ اگر میرا ہاتھ دوسرے کے لیے طمانچہ بن جاتا ہے تو یہ آزادی نہیں ہے۔

احتجاج حق ہے: جناب والا! آزادی صحافت اور آزادی اظہار رائے کے نام پر جو کچھ کیا جا رہا ہے یہ ہم پر اور ہمارے ایمان پر حملہ ہے، جسے ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی لیے بجا طور پر ساری دنیا میں مسلمان احتجاج کر رہے ہیں۔ یہاں میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کا تصور آزادی یہی ہے کہ آپ کو ہمارے دین اور ہمارے مذہب اور ہمارے نبی ﷺ کے اوپر گھناؤنے الزامات لگانے کا حق ہے تو ہمیں بھی حق حاصل ہے کہ ہم آپ پر نہ صرف تنقید

کریں بلکہ پتھر کا جواب پتھر سے دیں۔ لیکن اسی لیے مجھے ڈر ہے کہ اگر یہ روش جاری رہی تو مسلمانوں میں انتہاپسندی اور اشتعال انگیزی رونما ہوگی اور اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ سیاسی طور پر اس کا مؤثر جواب دیا جائے۔ حکومت آگے بڑھے اور جس طرح سعودی عرب اور لیبیا نے کیا ہے کہ جن ممالک نے یہ رویہ اختیار کیا ہے وہاں سے سفیر واپس بلائے ہیں، ان کے خلاف احتجاج کیا ہے، ان کے یہاں سے درآمدات کو روکا ہے، ہمیں بھی ایسے اقدامات کرنے چاہییں۔ یہ ہمارا حق ہے کہ ہم جس ملک سے چاہیں امپورٹ کریں یا نہ کریں۔ اگر آپ ہمارے جذبات اور ہمارے ایمان کا خیال نہیں رکھتے تو ہم آپ کی اشیاء کو اپنے ملک میں کیوں آنے دیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ مؤثر جمہوری اور معاشی احتجاج ضروری ہے اور میں درخواست کروں گا قائد ایوان سے کہ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ جس پر مشترکہ بیان دیا جائے تاکہ اس ایوان کی متفقہ رائے پوری دنیا کے سامنے آسکے۔

احتجاج کا طریقہ: جناب چیئرمین! توہین رسالت کے بارے میں جو کچھ مغربی میڈیا پیش کر رہا ہے اور اس پر پوری دنیا کے مسلمان جس ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں اس پر اس ایوان نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ہم نے بھی اپنے جذبات کو یہاں پیش کیا۔ پوری قوم اس مسئلہ پر صرف غم واندوہ کا شکار ہی نہیں بلکہ اس پر جس بے حسی کا مظاہرہ مغربی اقوام کر رہی ہیں اور یورپی یونین اور ڈنمارک جس طرح کھلے بندوں کہہ رہے ہیں کہ معذرت کی کوئی ضرورت نہیں وہ ایک نہایت شرمناک طرز عمل ہے۔ فکری طور پر اس طرح کی اشتعال انگیزی اور اس قسم کی نفرت انگیز چیزوں کو خاموشی کے ساتھ ہم برداشت کرتے ہیں تو یہ تاریخ کے ساتھ اور مسلمانوں کے ساتھ ظلم ہے۔ جو بھی عالمی قوت اس کی پشت پر ہو اس کی مذمت اور اس پر دباؤ ڈالنا اور اس کے طرز فکر کے خلاف مزاحمت کرنا ہمارے لیے اس وقت زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ لیکن جناب والا! میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری یہ پوری تحریک اور سارا احتجاج قانون کے دائرے میں اور عدم تشدد کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ ہمارا ہدف وہ عناصر ہیں جو اس وقت اسلام کو نشانہ بنا رہے ہیں لیکن لاہور میں اور خود طلباء کے ساتھ اسلام آباد

میں جو کچھ کیا گیا، اسی طرح پشاور میں جو واقعات ہوئے ہیں ان میں ہلاکتوں کی بھی اطلاعات آرہی ہیں، اسی طرح بہت سے مقامات پر عمارتوں کو آگ لگائی گئی ہے۔

جناب والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ایک سازش ہے۔ کچھ خاص عناصر اس تحریک کو غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں یا کوئی اور سیاسی کھیل کھیلنے کے لیے پر تشدد فضا بنائی جارہی ہے۔ میں پوری ذمہ داری سے یہ بات کہتا ہوں کہ جن لوگوں نے کل لاہور میں ہڑتال کی ہے یا جو نوجوان پورے ہفتے سے پشاور میں ہر روز مظاہرے کر رہے ہیں، ان کا سارا احتجاج پر امن، قانون کے دائرے میں اور مبنی بر ہدف ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جن حضرات نے لاہور میں آگ لگائی ہے اور پر تشدد واقعات کیے ہیں ان کا اس تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کہیں سے کوئی ایک گروپ آیا ہے اور اس نے یہ کھیل کھیل کر پوری احتجاجی مہم کو پٹڑی سے اتارنے کی کوشش کی ہے۔ پشاور کے بارے میں تو میں پوری ذمہ داری سے یہ بات کہتا ہوں کیونکہ میں آج بھی وہاں کے لوگوں کے ساتھ رابطے میں رہا ہوں۔ وہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ ۵۰ سے ۶۰ افراد کا ایک گروپ ہے جن کا پشاور سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ ان کا لباس اور انداز ہر چیز عام لوگوں سے مختلف تھی، یہ کام ان لوگوں نے یہاں آکر کیا ہے۔

میری نگاہ میں یہ مسئلہ ہم سب کے لیے فوری اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں یہ ضروری ہے کہ احتجاج ہو، احتجاج جاری رہے اور پر امن رہے، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کچھ عناصر اسے ملک کے جمہوری نظام کو پٹڑی سے اتارنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں یا بعض ایجنسیاں کوئی خاص کھیل کھیلنا چاہ رہی ہیں تو پھر اس کا ہدف صرف اپوزیشن ہی نہیں بنے گی بلکہ اس کا ہدف ملک کا پورا جمہوری عمل بنے گا۔ اس لیے ہمیں اچھی طرح سے ملک میں جمہوریت اور دستوری نظام کے مفاد کی خاطر سوچنا چاہیے کہ کیا وجہ ہے کہ حکومت جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ قانون کا تحفظ کرے، وہ اس کے بارے میں اپنی ذمہ داری ادا نہیں کر رہی ہے۔ لاہور کے بارے میں آپ کو معلوم ہے، جو اطلاعات وہاں سے آئی ہیں، وہ یہ ہیں

کہ پانچ، چھ گھنٹے تک پولیس کا کوئی رد عمل نہیں تھا۔ اسی طرح آگ بجھانے والا عملہ بھی موقع پر نہ پہنچ سکا اور آگ آدھی رات تک جلتی رہی ہے۔

جناب والا! یہ تمام چیزیں فوری طور پر توجہ طلب ہیں۔ میں حکومت کی ناکامی پر احتجاج کرتا ہوں اور یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری تحریک پر امن ہے، قانون کے دائرے میں ہے، اپنے دین، ایمان اور حقوق کے اظہار کے لیے ہے اور وہ جاری رہے گی۔ جو عناصر اس پر امن تحریک کو پٹڑی سے اتارنے یا سبوتاژ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، انہیں شناخت کیا جائے۔ حکومت کی ایجنسیوں کو چاہیے کہ بجائے اس کے کہ وہ ایسا کردار ادا کریں جس سے ایک مؤثر دینی اور جمہوری تحریک متاثر ہو، ان کا فرض ہے کہ جو اس تحریک کو سبوتاژ کر رہے ہیں، ان کو پکڑیں۔ آپ کی انٹیلی جنس ایجنسیاں کہاں سو رہی ہیں؟ پولیس کی فورس کہاں ہے؟ اسے چاہیے کہ جو اس کا اصل کام ہے، اسے انجام دے۔ میں جو خطرات دیکھ رہا ہوں، وہ یہ ہیں کہ خدانخواستہ اس نہایت اہم اور جذباتی ایشو کی آڑ میں تشدد پھیلا کر کوئی اور کھیل ہے جو کھیلا جا رہا ہے۔ اس معاملے میں حکومت اور اپوزیشن مل کر کوئی فیصلہ کریں۔ اس لیے کہ یہ ہمارا ایک مشترک مسئلہ ہے۔ یہ محض خاص جماعتوں کا یا خاص علاقے کا مسئلہ نہیں ہے۔

بلاشبہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی احتجاجی تحریک کو قانونی اور جمہوری خطوط پر آگے بڑھائیں۔ لیکن اگر یورپ کی حکومتیں، ان کے اخبارات اور سیاسی عناصر یہ نفرت انگیز راستہ اختیار کریں گے تو میں متنبہ کرتا ہوں کہ مسلمان ٹھنڈے دل سے برداشت نہیں کریں گے۔ ہم نے کبھی اسے برداشت نہیں کیا۔ کیونکہ ہمارے ایمان اور ہمارے نبی ﷺ کے اوپر حملہ ہم پر حملہ ہے اور ہم اس کے لیے ہر ممکن رد عمل لازماً کریں گے۔ یہ ہمارا حق ہے۔

جناب والا! بہتر یہی ہے کہ مذاکرات اور افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کیجیے لیکن یہ بھی واضح کر دیجیے کہ جس طرح آپ کہتے ہیں کہ ہمارا حق ہے کہ اسلام کے نبی ﷺ پر ہم اس طریقے سے حملے کریں تو جواباً کیا ان لوگوں کو جو 'دہشت گردی' کو کسی بھی وجہ سے صحیح سمجھتے

ہیں یہ اختیار نہیں کہ وہ 'دہشت گردی' کی تبلیغ کریں۔ کیونکہ دہشت گردی کے لیے یہ ان لوگوں کی رائے ہے، کیا یہ آزادی اظہار رائے کے نام پر کی جانے والی سرگرمیوں کی طرح جائز نہ ہوگا؟ معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے، آزادی کی کچھ حدود ہیں اور آزادی کچھ ذمہ داریوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ آزادی کے نام پر ہمارے لیے یہ حملے قابل برداشت نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ایوان کو اس پر مؤثر احتجاج کرنا چاہیے۔

جناب والا! میں چاہتا ہوں کہ یہ پہلو بھی سامنے آئے اور ایوان بھی اس معاملے میں مؤقف اپنائے، آپ بھی اس معاملے میں رہنمائی دیں اور اس معاملے میں حکومت اور اپوزیشن سب مل کر اس تحریک کو قانونی اور جمہوری طریقے سے آگے بڑھائیں تاکہ ہم دنیا کو جو پیغام دینا چاہتے ہیں، وہی پیغام دنیا کے سامنے جائے اور ہم آپس میں ہی الجھ کر نہ رہ جائیں۔

(۳فروری، ۱۵فروری ۲۰۰۶ء)

دوسری اسرائیل-حزب اللہ جنگ

جناب چیئرمین! میں اس امر پر دلی مسرت کا اظہار کرتا ہوں کہ اسرائیلی جارحیت، ظلم، ریاستی دہشت گردی اور نسل کشی کی کارروائیوں پر سینیٹ اپنے پہلے دن کے اجلاس میں ہی اس کا نوٹس لے رہی ہے اور اس سلسلے میں پاکستانی قوم کے جذبات، احساسات اور توقعات کا اظہار ایک ایسی قرارداد کی شکل میں کر رہی ہے جس میں اپوزیشن اور حکومت دونوں میں اتفاق رائے ہے۔ میں وسیم سجاد اور حکومت کے دوسرے نمائندوں کے اس تعاون پر شکریہ ادا کرتا ہوں اس لیے کہ اس کی ابتدا اپوزیشن نے کی تھی اور اسے خوش آئند قرار دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی کہنے کی اجازت دیجیے کہ اپوزیشن کے جذبات، بلکہ قوم کے جذبات اس سے کہیں زیادہ بپھرے ہوئے ہیں جس کا اظہار ہم قرارداد میں کر رہے ہیں۔ کیونکہ قرارداد متفقہ ہونے کی بنا پر، بعض ایسے پہلو قرارداد کے الفاظ میں شامل ہوئے نہیں جو ہمارے خیال میں اسے اور مؤثر بنا دیتے۔ لیکن جو کچھ قرارداد میں آگیا اس کے پیچھے قوم اور پوری امت مسلمہ بلکہ پوری انسانیت کے جذبات کو شامل سمجھنا چاہیے۔ اس وقت جو لاوا پک رہا ہے اس آتش فشاں کے پھوٹنے سے پہلے مؤثر اقدام کرنے کی ضرورت ہے ورنہ، صرف یہ خطہ نہیں، دنیا کا امن بھی خطرے میں ہے۔

جارحیت کا آغاز اور پس منظر

جناب والا! پہلی بات یہ سمجھنے کی ہے کہ یہ اسرائیلی جارحیت ۲۵ جون ۲۰۰۶ء کو فلسطین پر ازسرنو فوج کشی کی صورت میں شروع ہوئی تھی، یہ بارہ جولائی ۲۰۰۶ء کو شروع نہیں ہوئی۔ ۲۵ جون سے لبنان پر خوفناک بمباری جنگی پیمانے کی شکل میں کی جا رہی ہے۔

چنانچہ واضح رہنا چاہیے کہ جارحیت کا آغاز ۱۲جولائی سے بہت پہلے ہوا تھا۔ جناب والا! امت مسلمہ پر یہ ایک ظلم ہے کہ بیت المقدس کی سرزمین، جو ایک مقدس سرزمین ہے، وہاں دنیا بھر سے یہودیوں کو لا کر بسایا گیا اور وہاں کے اپنے رہنے والوں کو بے دخل کیا گیا۔ ان بے دخل کیے جانے والوں کی تعداد چار ملین سے زیادہ ہے، تقریباً اتنے ہی جتنے کہ آج سرزمین فلسطین کے دونوں حصوں میں موجود عربوں کی تعداد بنتی ہے۔ چار ملین بے دخل کیے جانے والے فلسطینیوں کے مقابلے میں تقریباً ساڑھے چار ملین یہودیوں کو پوری دنیا کے تمام علاقوں سے لا کر زبردستی دہشت گردی کے ذریعے یہاں بسایا گیا۔ یہ مسلح دہشت گرد قوتیں تھیں جنہوں نے صرف مسلمانوں اور عربوں کو ہی نہیں مارا بلکہ عیسائیوں پر بھی تشدد کیا اور حتٰی کہ برطانیہ کو بھی نہیں چھوڑا جس کو اس معاملہ میں اختیار دیا گیا تھا اور جو ان کی سرپرستی کر رہا تھا، ہوٹل ڈیوڈ[1] کا واقعہ تاریخ کا حصہ ہے جس میں ۸۲ عرب رہنماؤں اور آدھے درجن برطانوی افسروں کو بموں سے اڑایا گیا تھا۔ یہ ساری تاریخ ہے۔

جناب والا! سب سے اہم بات جو سمجھنے کی ہے یہ ہے کہ اصل میں ایک نوآبادیاتی سامراجی مغربی ریاست عرب سرزمین پر قائم کی گئی ہے۔ جہاں تک یہودیوں کے سرزمین فلسطین پر رہنے کا تعلق ہے تو مسلمانوں کے دور میں ان کے لیے امن موجود تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط میں بھی تقریباً چھپن ہزار یہودی سرزمین فلسطین پر پرامن زندگی گزار رہے تھے البتہ فلسطینیوں نے اسرائیلی صیہونی تصور کی مخالفت کی اور یہ مخالفت وہ آج تک کر رہے ہیں۔ اس لیے اسرائیلی آبادکاروں کی یہاں موجودگی اور ان کی حکومت ایک ناجائز قبضہ کی علامت ہے۔ اور جب تک قبضہ ہے مزاحمت ہوگی۔ اس مسئلے کا مستقل حل صرف قبضے کا خاتمہ ہے۔

---

[1] ۲۲جولائی ۱۹۴۶ء کو زیرزمین مسلح انتہاپسند دہشت گرد صیہونی تنظیم ارگن زوی لیومی نے فلسطینی عربوں کا روپ دھار کر کنگ ڈیوڈ ہوٹل پر بمباری کر کے مختلف اقوام کے ۹۱ افراد کو ہلاک اور ۴۶ کو زخمی کر دیا۔ کنگ ڈیوڈ ہوٹل میں برطانوی انتداب کے زمانے میں فلسطینی حکومت اور برطانوی مسلح افواج کے صدر دفاتر قائم تھے۔

جناب والا! ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ جو پر امن شہری وہاں پر رہنا چاہتے ہیں ان کو نکال باہر کریں۔ اگر وہ غلط طریقے سے آئے ہیں تب بھی مسلمان ان کو اسی طرح رہنے کا حق دیتے ہیں جس طرح باقیوں کو دیتے ہیں۔ لیکن جس طریقے سے تمام نو آبادیاتی طاقتوں کو اپنی نو آبادیوں سے قبضہ چھوڑ کر نکلنا پڑا۔ اسی طرح ان نو آبادکاروں کو بھی قبضہ چھوڑنا ہو گا۔

جنگ کا منظر نامہ

جناب والا! دوسری بات یہ ہے کہ یہ جو کہا جارہا ہے کہ دو اسرائیلی فوجیوں کو اغواء کر لیا گیا اور ایک فوجی کو فلسطین کے اندر اغوا کر لیا گیا، یہ سارے کا سارا الفاظ کا کھیل اور صریحاً دھوکہ ہے۔ اس کے لیے قانونی لغت کے اندر صحیح لفظ جنگی قیدی ہے۔ اس وقت فریقین حالت جنگ میں ہیں اور اس حالت میں برابر حملے اور گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت دس ہزار فلسطینی مرد، عورتیں اور بچے اسرائیل کی جیلوں میں ہیں جن میں چار سو بچے اور ۱۶۰ عورتیں شامل ہیں۔

۲۵ جنوری کے انتخابات میں پہلے حماس کو کامیابی ملی جو ایک جمہوری قوت ہے، یوں وہاں کے عوام نے اسے اپنا اعتماد دیا ہے، لیکن اسرائیل نے اسے ماننے سے انکار کیا۔ اور یہی امریکہ اور یورپین اقوام نے کیا ہے۔ اس کے بعد سے فلسطینیوں کے لیے عرصہ حیات تنگ کیا جارہا ہے۔ حتٰی کہ ٹیکسوں میں ان کا جو حصہ ہے وہ بھی ان کو نہیں مل رہا ہے اور نہ ہی ان کو خوراک مل رہی ہے کیونکہ ان کے علاقوں میں آمد و رفت کے راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ دوسری جانب حماس کی کابینہ کے نصف افراد اور پارلیمنٹ کے ایک تہائی ممبران کو اسرائیل نے اغواء اور گرفتار کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں موجود ہیں۔ اس تسلسل کے اندر حماس نے بھی فلسطین میں ایک اور لبنان میں دو جنگی قیدیوں کو اپنے قبضے میں لیا اور یہ کہا کہ جس طرح اس سے پہلے ۲۰۰۴ء میں مذاکرات اور سودے بازی کے بعد ایک اسرائیلی کے بدلے میں چار سو فلسطینیوں کو رہا کیا گیا تھا، اسی طرح اب بھی مذاکرات کے ذریعہ ہی کوئی فیصلہ ممکن ہو سکتا

ہے۔ یہ ایک سیاسی عمل تھا لیکن اس کا نام اور سہارا لے کر فوج کشی کی گئی۔

فلسطین میں غزہ کے علاقے میں اس وقت تک دو سو افراد شہید ہو چکے ہیں، ایک ہزار سے زیادہ زخمی ہیں اور علاقے کے علاقے تباہ کر دیے گئے ہیں۔ لبنان کی حالت اس سے بھی خراب ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق سات سو لیکن آزاد اندازے کے مطابق ایک ہزار سے زیادہ افراد وہاں شہید کیے جا چکے ہیں۔ زخمیوں کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ بنیادی تعمیراتی ڈھانچہ تباہ کر دیا گیا ہے۔ پل، بجلی بنانے کے کارخانے، پانی سپلائی کرنے والے کارخانے، سڑکیں، عمارات اور مکانات، قصبے اور دیہات غرض ہر جگہ کو تباہ کیا جا رہا ہے، حتٰی کہ کل کے واقعے میں وہ علاقہ اور وہ جگہ جہاں پر معذور بچے تھے، ان کو بھی نشانہ بنا کر کے تباہ کیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کے اس علاقے کے ذمہ دار ہونے کی وجہ سے دوبارا اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے خود ٹیلی فون کر کے اسرائیلی قیادت کو متوجہ کیا لیکن اس کے باوجود اقوام متحدہ کی چوکی کو نشانہ بنایا گیا جس میں چار افراد مارے گئے۔ یہ ایک قوم کے خلاف جنگ بلکہ نسل کشی ہے۔ یہ ظلم ہے اور اسرائیل ظلم اس لیے کر رہا ہے کہ اس کی پشت پر امریکہ اور برطانیہ ہیں۔

سیاسی وسفارتی منظر نامہ: مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت جرمنی بھی اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ جہاں تک مسلمان ممالک کے حکمرانوں کا مسئلہ ہے وہ بے بس نہیں ہیں بلکہ بے حس ہیں۔ وہ خود اپنے مفادات کی خاطر بنیادی طور پر اس پوری جارحیت کے ذمہ دار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس واقعہ کو ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا ہے اور اسلامی کانفرنس تنظیم اس قدر تاخیر کے بعد اب اپنی کونسل بلا رہی ہے۔ عرب لیگ آج تک اس کے خلاف بل پاس نہیں کر سکی ہے۔ جناب والا! میں صاف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تمام بھی اسرائیلیوں کی طرح مجرم ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ پوری مسلم دنیا میں بے چینی ہے۔ ابھی جو سروے لبنان کا ہوا ہے، وہ دیکھنے کے لائق ہے، یہ سرکاری سروے ہے جو لبنان کے انگریزی اخبار میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ ۸۹ فی صد افراد حزب اللہ کی حمایت کر رہے ہیں۔ بات کی جاتی

ہے کہ وہ شیعہ ہیں لیکن اگر آپ اس سروے کی تفصیل دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ۹۳فی صد شیعہ ، ۸۸فی صد سنی، ۸۶فی صد عیسائی، ۸۴ فی صد دروز ان کی حمایت کر رہے ہیں۔ یہ قومی جنگ ہے، اس کا فرقوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پوری دنیا کے مسلمان بلکہ میں کہوں گا کہ پوری دنیا کے عوام یہ جذبہ رکھتے ہیں۔

جناب والا! اس صورت حال کی ذمہ داری جس طرح اسرائیل پر ہے ، اسی طرح امریکہ پر ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمانے میں امریکہ نے جنگ کے دوران، نہ صرف یہ کہ جنگ بندی کے لیے قرارداد یورپی یونین اور سلامتی کونسل میں پاس نہیں ہونے دی بلکہ عملاً اسے ویٹو کیا ہے۔ اس کے ساتھ وہ اسرائیل کے لیے اسلحہ بھیج رہا ہے، پٹرول بھیج رہا ہے اور وہ میزائل جو برقیاتی رہنمائی کے خودکار نظام سے نشانہ لگائیں، وہ بھیج رہا ہے ، یہ امریکہ کا کردار ہے۔

اسرائیل ناقابل تسخیر نہیں

جناب والا! میں تیسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قوت کا عدم توازن اپنی جگہ لیکن فلسطین میں حماس نے اور لبنان میں حزب اللہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسرائیل کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو، وہ ناقابل تسخیر نہیں ہے۔ انہوں نے اسے للکارا ہے اور ضرب لگائی ہے۔ اور جناب والا! یہ پہلی مرتبہ ہے کہ حقیقتاً اسرائیل کی مزاحمت کی جارہی ہے۔ اس سے پہلے کی جنگوں میں عرب حکومتوں نے چند گھنٹوں میں اسرائیل کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے لیکن حزب اللہ نے اس سے پہلے بھی ۲۰ سال، ۲۲ سال کے قبضہ کے بعد ۲۰۰۰ء میں اسرائیل کو مجبور کیا کہ وہ جنوبی لبنان سے واپس جائے۔ آج بھی معاملہ یہ ہے کہ ایک دن کی جنگ میں جب ۱۳ اسرائیلی فوجی مارے گئے، ۱۳۱ زخمی ہوئے اور ان کے ٹینک تباہ ہوئے تو اگلے دن انہوں نے اپنی فوج واپس بلالی۔ میں کہتا ہوں کہ آئندہ بھی اسرائیل کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کی موجودگی میں قبضہ کر سکے۔ اسرائیلی انہیں وقتی طور پر تباہ کر سکتے ہیں،

مار سکتے ہیں، نقصان پہنچا سکتے ہیں لیکن وہ ان کو محکوم نہیں بنا سکتے، وہاں رہ نہیں سکتے۔ یہ عوامی مزاحمت ہے، یہ محض حکومتوں کا معاملہ نہیں ہے۔

جناب والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسرائیل کو یہ زعم تھا کہ اس کے پاس ایسی ٹیکنالوجی ہے کہ جس کی بنا پر کوئی اس کو للکار نہیں سکتا ہے۔ لیکن حماس اور حزب اللہ نے جنگ کو، اس وقت جہاں اسرائیل کی اپنی حکومت ہے، وہاں پہنچا دیا ہے۔ حیفہ جو تقریباً ۳۰ کلو میٹر اسرائیل کے اندر ہے، اسے نشانہ بنایا ہے، ۴۰ کلو میٹر تک وہ اپنے میزائل بھیج چکے ہیں۔ اسرائیل کے اب تک ۹ ٹینک تباہ ہو چکے ہیں، دو جہاز گرائے گئے ہیں اور ایک پانی کا جنگی جہاز جو اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی سے مسلح تھا، انہوں نے اسے ڈبویا ہے جس کے اندر ۱۴۔ اسرائیلی سپاہی مارے گئے ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ٹیکنالوجی کے عدم توازن کے باوجود مقابلہ ہو سکتا ہے اور مقابلہ کر کے دکھایا ہے اور اسرائیل کی حدود کے اندر داخل ہو کر کیا ہے۔

مسلم حکومتوں کا کردار

جناب والا! اگلی بات میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ پوری دنیا میں کہا جا رہا ہے کہ یہ شیعہ، سنی معاملہ ہے لیکن حماس جو سنی ہیں، حزب اللہ جس میں شیعہ ہیں، دونوں مل کر ایک مشترکہ مقصد کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کام کر رہے ہیں۔ کوئی شیعہ، سنی کا مسئلہ نہیں ہے، ہم سب ایک ہیں، ہمارا دشمن ایک ہے، یہ وہ اتحاد ہے جس میں ہماری قوت ہے۔

جناب والا! اس وقت ہمارا فرض کیا ہے؟ خوشی ہے کہ آج کوئی بیان کابینہ نے جاری کیا ہے اور کچھ تھوڑی بہت مدد بھی بھیجی ہے لیکن جناب والا! جب اس بے دردی کے ساتھ عام انسانوں کو ظلم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے تو کیا ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم قرار داد پاس کر دیں یا کچھ خوراک بھیج دیں؟

جناب والا! اسلامی کانفرنس تنظیم صرف اس لیے بنائی گئی تھی کہ فلسطین کا مسئلہ

مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۹۶۹ء میں جب اقصیٰ مسجد کو آگ لگائی گئی، اس وقت اس کے ردعمل میں OIC قائم ہوئی تھی۔ لیکن یہ تنظیم اس وقت کیا کر رہی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ وہ عرب حکمراں جو اس وقت رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، جو شیعہ، سنی کی بات کر رہے ہیں۔ درحقیقت وہ تمام لوگ جو امریکہ کے اشارے پر کام کر رہے ہیں وہ اس پوری صورتحال کے ذمہ دار ہیں۔ مسلمان عوام کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ایسے حکمرانوں سے نجات حاصل کریں تاکہ مسلم امت اپنے اصل مقاصد واہداف یعنی مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ، ظلم کے خلاف جنگ اور جہاں جہاں مسلمان مقبوضہ ممالک میں ہیں، ان کی آزادی کے لیے جدوجہد کر سکے۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ تمام حکومتیں جو اس کی راہ میں حائل ہیں، وہ بدلیں یا انہیں بدل دیا جائے گا، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت پاکستانی حکومت کا فرض ہے کہ صرف عالمی رائے عامہ متحرک کرنے کی کوشش ہی نہ کرے بلکہ اقوام متحدہ اور او آئی سی کو متحرک کرے اور مسلم ممالک کے لیے مشترکہ دفاعی پالیسی بنائی جائے جس طرح نیٹو (NATO) ہے۔ نیٹو کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ نیٹو کے کسی ایک ملک پر حملہ، نیٹو پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ جب تک ہم مسلمان ممالک یہ معاہدہ نہیں کرتے اور تمام مل کر اپنی فوجی قوت سے ایک دوسرے کے دفاع کا اہتمام نہیں کرتے، ہمیں اسی طرح نرم نوالہ بنایا جائے گا۔

جناب والا! جہاں میں اس قرارداد کی مکمل تائید کرتا ہوں وہاں میں یہ بات بھی کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ صرف ہمارے جذبات کے ایک حصے کی ترجمان ہے۔

وقت کی ضرورت یہ ہے کہ ہم خواب غفلت سے بیدار ہوں۔ اللہ نے ہمیں وسائل بھی دیے ہیں، ہمارے پاس ذرائع بھی ہیں لیکن ستم یہ ہے کہ وہ اربوں ڈالر، دو چار ارب نہیں سینکڑوں ارب ڈالر ہیں، جو عرب ممالک نے نام نہاد اسلحہ کی درآمد پر خرچ کیے ہیں، وہ سارا اسلحہ بے کار پڑا ہے، کسی لائق نہیں ہے۔ وہ صرف کمیشنوں اور امریکہ اور یورپ کی اسلحہ کی

صنعت کو فنانس کرنے کے لیے درآمد کیا گیا ہے۔ جب تک ہم عوام کے پیسے کو امانت نہ سمجھیں اور ایسا نہیں ہے کہ اصل قوت جو علمی، اخلاقی، سیاسی، معاشی، ٹیکنالوجیکل اور عسکری قوت ہے اسے حاصل نہ کریں۔ ہم صورت حال میں کوئی جوہری تبدیلی نہیں لا سکیں گے اور ایسا نہیں ہے کہ اس کے وسائل ہمارے پاس نہ ہوں۔ ستم یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں اور عوام کے دل ایک ساتھ نہیں دھڑکتے۔ حکمرانوں کا قبلہ کچھ اور ہے اور امت کا قبلہ کچھ اور۔ ان کے درمیان جو کشمکش ہے، یہ ہمارا اصل مسئلہ ہے اور جب تک یہ ہم آہنگی پیدا نہیں ہوتی، ہم اپنے وسائل کا صحیح استعمال نہیں کر سکیں گے۔

حزب اللہ اور حماس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قوت کے عدم توازن کے باوجود اگر غیرت، ایمان اور مقصد سے دلچسپی ہے، اگر حق کی خاطر جان دینے کا جذبہ ہے تو پھر آپ کو کوئی محکوم نہیں بنا سکتا، کوئی آپ کو دبا نہیں سکتا۔ یہ پیغام ہے اور ہمیں اسی پیغام کو لے کر اٹھنا ہے اور اس معاملے میں پاکستان ایک مثبت کردار ادا کر سکتا ہے لیکن ہماری حکومت نے بھی ابھی تک اس معاملے میں اپنی ذمہ داری ادا نہیں کی۔ اس لیے میں اپوزیشن کی طرف سے واضح کرتا ہوں کہ حکومت نے جو دو قدم بڑھائے ہیں، وہ اچھے ہیں لیکن وہ ناکافی ہیں۔ آپ کو اس معاملے میں امت کے جذبات، عزائم، ضرورتوں اور مسائل، جن مظالم کا ہم شکار ہیں، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھنے کی ضرورت ہے۔ جھنجھوڑیئے، بیدار کیجیے، منظم کیجیے، وسائل آپ کے پاس ہیں، انہیں منظم کیجیے، اپنی ترجیحات کو درست کیجیے اور یقین رکھیے کہ ہم آج بھی کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہیں۔ (۲ اگست ۲۰۰۶ء)

اقوام متحدہ اور عالمی اداروں کا کردار

جناب والا! اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اسرائیل کا قیام قوت، بین الاقوامی سازش اور سیاست کے ذریعہ استعماری مقاصد حاصل کرنے اور مسلم دنیا کے قلب میں ایک ایسے وجود کو مسلط کرنے کی کوشش ہے جو سرطان کی طرح اس پورے

جسم کو تباہ کر دے۔ یہ بات بالکل حقائق پر مبنی ہے اور ہم جب تک اس حقیقت کو نہ سمجھیں، اسرائیل کے کردار کو نہیں سمجھ سکتے۔

جناب والا! اسی ضمن میں دوسری بات میں یہ کہوں گا کہ اسرائیل ایک بدمعاش (Rogue) اور دہشت گرد ریاست ہے اور دہشت گردی اور قوت کے استعمال ہی سے وہ قائم بھی ہے۔ اس نے پورے علاقے کو دہشت زدہ کیا ہوا ہے۔ میں خاص طور پر آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس نے پچھلے سال غزہ پر جو حملہ کیا، اس میں ڈیڑھ ہزار معصوم انسان شہید ہوئے تھے اور اس وقت سے یہ محاصرہ کیا گیا ہے۔ دو ماہ پہلے دبئی میں جعلی پاسپورٹ پر اسرائیل کی سرکاری ایجنسی کے ذریعے حماس کے لیڈر کو قتل کیا گیا اور اب یہ واقعہ[1] ہوا ہے۔ یہ ایک پوری سیریز ہے، اس لیے ہمیں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اسرائیل کا مقابلہ جب تک حکمت اور قوت سے نہیں کیا جائے گا، ہم فلسطین کی آزادی حاصل نہیں کر سکیں گے اور القدس کو دشمن کی گرفت سے نہیں نکال سکیں گے۔

اس سلسلے میں جناب چیئرمین! ایک بڑی اہم چیز یہ ہے کہ ترکی نے امدادی جہاز بھیجنے کا یہ اقدام خالصتاً امن، سلامتی اور انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ادویہ اور خوراک پہنچانے کے لیے اٹھایا۔ ۶ جہاز اس قافلہ کا حصہ ہیں، جنہیں اس وقت محصور کیا گیا ہے اور ۷۰۰ افراد کو گرفتار کیا گیا ہے، ۲۰ سے زیادہ شہید کیے جا چکے ہیں، ۶۰ سے ۱۰۰ تک زخمی ہیں اور ان کے ساتھ جس طرح کا سلوک کیا جا رہا ہے وہ تشدد و اذیت رسانی پر مبنی ہے اور بین الاقوامی قانون اور انسانیت کے خلاف جرم ہے۔ اس میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اسرائیل کے انسانیت کے خلاف اس جرم، اس کی جارحیت، اس کی اس جنگی حکمت عملی اور اس کے ان مظالم کی بھرپور مذمت کی جائے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ پوری دنیا میں اسرائیل کا صحیح چہرہ سامنے آیا ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس مہم کو جاری رکھا جائے۔

---

[1] ترکی کی جانب سے بھیجے گئے بحری جہازوں کے امدادی قافلہ فریڈم فلوٹیلا پر حملہ۔

جناب والا! اس کے ساتھ ہی میں تائید کرتا ہوں کہ عالمی فوجداری عدالت میں مسلمان ممالک اسرائیل کے مسئلے کو لے کر جائیں تاکہ دنیا میں جو بھی قانونی ادارے موجود ہیں، ان میں کم از کم ہم اپنی بات کو پہنچا سکیں۔

اسی طرح اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل اور جنرل اسمبلی ہے۔ بلاشبہ اقوام متحدہ کوئی مؤثر ادارہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ بڑا اہم فورم ہے۔ جناب چیئرمین! میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ جنرل اسمبلی نے ۵۰ سے زیادہ قراردادیں اسرائیل کے خلاف منظور کی ہیں اور سیکورٹی کونسل میں بھی ۴۰ سے زیادہ قراردادیں امریکہ نے ویٹو کی ہیں۔ آج بھی امریکہ کے ادارے ہمیں تو جمہوریت اور انسانی حقوق کا درس دیتے ہیں اور اس طرح کے عنوانات کو بہانہ بنا کر ہمیں چارج شیٹ کرتے ہیں۔ کیری لوگر بل میں پاکستان، پاکستان کی افواج اور پاکستان کی ایجنسیوں کا نام لکھ کر چارج شیٹ کیا جاتا ہے۔ اس وقت جو فیصل شہزاد کا ڈرامہ رچایا گیا ہے، اس کی بنیاد پر کس طرح پاکستان پر دباؤ ڈالا جارہا ہے، یلغار کی جارہی ہے۔ درحقیقت ان کی طرف سے بنیادی ٹیسٹنگ ہوگئی ہے اور منصوبہ بنایا جارہا ہے کہ پاکستان پر حملہ کیا جائے۔ لیکن اسرائیل کیا کر رہا ہے اس پر امریکہ خاموش ہے۔ اسے یہ توفیق بھی نہیں ہوئی کہ اسرائیلی جارحیت کی صرف مذمت ہی کر دے۔

جناب والا! یہ تضادات ہمارے سامنے ہیں اور اس کی روشنی میں ہمارا فرض ہے کہ ہم امریکہ کو بھی بے نقاب کریں اور اسرائیل کو بھی بے نقاب کریں۔

اگلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امداد بھیجنے کی بات ختم نہیں ہوئی۔ آئرلینڈ نے ایک جہاز اسی قسم کی امداد کا بھیجا ہے اور کل ترکی نے اعلان کیا ہے کہ ہم دو مزید جہاز بھیج رہے ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑا اہم معاملہ ہے اور میں آپ کے توسط سے حکومت سے یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ پاکستان کو ترکی کے ساتھ امداد بھجوانے کے اس عمل میں شریک ہونا چاہیے۔ ہمیں بھی یہاں سے جہاز اور ان کے لیے امداد بھیجنی چاہیے۔ ہمارے صحافی، سیاستدان، قیادت اور ہمارے رضاکار بھی جائیں۔ ہم ترکی کے ساتھ مل کر یہ کام

کریں، جو قربانی بھی دینی پڑے وہ دی جائے لیکن یہ وقت ہے کہ ہم پوری عالمی سطح پر ایک نئی تحریک اٹھاسکتے ہیں۔ پائیدار امن کے لیے ضروری ہے کہ فلسطین کا مسئلہ حق خودارادیت اور ان اصولوں کی بنیاد پر حل ہو جن پر عمل کیے بغیر علاقے میں اور دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے اور میں حکومت سے مطالبہ کرتا ہوں کہ محض زبانی جمع خرچ نہیں بلکہ یہ وقت عمل اور اقدام کرنے کا ہے، اس کو ضائع نہ ہونے دیا جائے۔

(۳ جون ۲۰۱۰ء)

ضمیمہ: فہرست عنوانات ''دہشت گردی کے خلاف جنگ، پاک امریکہ تعاون اور اس کے اثرات''

جلد دوم

- پیش لفظ V
- تعارف VII

داخلی سلامتی اور امن وامان کے مسائل

- پاکستانی سرحدوں کے اندر امریکی کارروائیاں ۰۳
- ایبٹ آباد آپریشن ۲۰۱۱ ..... ۲۵
- امریکہ کے ساتھ تعاون: امن وامان کی صورت حال پر اثرات-۱، ۲ ..... ۳۵
- صدر پر حملہ اور ان کے سیکورٹی انتظامات ۶۱
- لال مسجد پر یورش اور جامعہ حفصہ کا بحران ۶۹
- سوات آپریشن اور اندرون ملک بے گھر افراد کا مسئلہ ۹۱
- عافیہ صدیقی کی گرفتاری اور سزا ۱۰۳
- بے نظیر بھٹو اور دیگر قائدین پر حملے ۱۰۷
- سانحہ راولپنڈی: فرقہ واریت کی جنگ کی طرف دھکیلنے کی کوشش ۱۱۵
- بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں دہشت گردی اور قوت کا استعمال ۱۲۷
- کوئٹہ میں عاشورہ کے موقع پر دہشت گردوں کا حملہ ۱۳۷
- منی لانڈرنگ اور دہشت گردی کی روک تھام کے لیے قانون سازی ۱۴۱
- امریکی ڈرون حملے اور سپلائی لائن کی بندش ۱۶۳
- زمینی حقائق کے ادراک کی ضرورت ۱۸۵
- ضمیمہ: 'دہشت گردی کے خلاف جنگ، پاک امریکہ تعلقات اور اس کے اثرات' جلد اول کی فہرست عنوانات ۲۰۳
- اشاریہ ۲۰۵

اشاریہ

آ

آزاد کمیشن,۴۷
آزادی اظہار کی حدود,۱۶۶
آزادی صحافت,۵۳,۱۶۳,۱۶۶
آزادی کی حدود,۱۶۶
آسٹریلیا,۱۶۳
آغا خان ہسپتال کراچی,۹۲
آفتاب شیر پاؤ وزیر داخلہ,۴۸
آئینی ترمیم ۱۸ ویں,۱۱۶
آئرلینڈ,۱۸۰
آئی ایس آئی (انٹر سروسز انٹیلیجنس),۲۱

ا

ابو غرائب (جیل) عراق,۱۵۲,۱۶۳,۱۶۴
اتحادی افواج,۱۶۲
اٹلانٹک معاہدے,۱۴۴
احتجاج کا حق,۱۶۶/ احتجاج کا طریقہ,۱۶۷
ادارہ خدمت خلق,۱۲۲
ارگن زوی لیومی (Irgun Zvai Leumi) مسلح انتہا پسند دہشت گرد صیہونی تنظیم,۱۷۲
اُسامہ بن لادن,۱۲۶
اسپین,۳۱,۶۴/ اسپین کا وزیر اعظم,۳۱
استصواب رائے کا حق,۴۰
استنبول,۱۰۸
اسرائیل,۱۴, ۲۷, ۶۸, ۷۴, ۹۹, ۱۲۸, ۱۵۱, ۱۵۶, ۱۷۱, ۱۷۳, ۱۷۴, ۱۷۵, ۱۷۶, ۱۷۸, ۱۷۹, ۱۸۰
اسرائیل کی حدود,۱۷۶/ اسرائیل کے ساتھ تعلقات, ۱۴
اسرائیلی آباد کار,۱۷۲/ اسرائیلی جارحیت,۱۷۱,۱۸۰/ اسرائیلی صیہونی تصور,۱۷۲/ اسرائیلی لابی,۱۴
اسلام آباد,۸۵,۱۰۱,۱۰۶,۱۱۴,۱۲۲,۱۲۶,۱۳۱,۱۶۷
اسلام کے خلاف جنگ,۷,۶۲,۶۳
اسلاموفوبیا,۶۶
اسلامی تحریکات,۶۰/ اسلامی تنظیمیں,۷,۱۲۲/ اسلامی خدمات,۱۲۲
اسلامی انتہا پسندی,۲۸/ اسلامی دہشت گردی,۶۳,۱۵۵
اسلامی ریاست,۲۰/ اسلامی شناخت,۱۲۳
اسلامی کانفرنس تنظیم,۴۹, ۶۶, ۶۷, ۱۳۲, ۱۳۳, ۱۵۰, ۱۷۴, ۱۷۶, ۱۷۷/ اسلامی ممالک,۱۴
اطلاعات کی آزادی,۵۶,۱۶۳
اعتدال پسند اسلام,۶۴
افراط زر,۹
افغانستان, ۱, ۸, ۱۴, ۱۷, ۱۸, ۲۲, ۲۳, ۲۴, ۲۵, ۲۶, ۲۹, ۴۸, ۴۹, ۵۲, ۵۴, ۵۸, ۶۰, ۶۱, ۶۵, ۷۵, ۸۰, ۸۶, ۹۹, ۱۰۴, ۱۰۷, ۱۰۸, ۱۰۹, ۱۱۰, ۱۱۵, ۱۱۷, ۱۱۹, ۱۲۶, ۱۴۱, ۱۵۶
افغانستان پالیسی,۴۸,۱۰۶/ افغانستان کا استحکام,۱۰۹
اقبال (علامہ محمد),۱۰۹,۱۳۱,۱۵۹
اقتصادی ایڈز,۱۱۷
اقدام جنگ,۱۲۸
اقصیٰ مسجد,۱۷۷
اقوام متحدہ,۴, ۱۳, ۲۰, ۴۰, ۵۵, ۶۶, ۶۷, ۱۰۷, ۱۱۱, ۱۲۳, ۱۳۳, ۱۴۰, ۱۴۲, ۱۴۳, ۱۴۴, ۱۴۷, ۱۵۲, ۱۵۳, ۱۶۱, ۱۶۲, ۱۶۳, ۱۶۴, ۱۷۴, ۱۷۷, ۱۷۸, ۱۸۰

اقوام متحدہ کا چارٹر,۲۰,۵۵,۱۰۷,۱۱۱,۱۴۲,۱۶۱,۱۶۲
اقوام متحدہ کمیشن برائے انسانی حقوق,۶۶,۱۶۳,۱۶۴
اقوام متحدہ کی قرار دادیں,۴,۱۳,۴۰
اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل,۱۲۳,۱۴۷,۱۵۳,۱۶۲,۱۸۰
اقوام متحدہ کے قوانین کی خلاف ورزی,۱۴۴
اقوام متحدہ کے کنونشنز,۵۶
الجزیرہ(Al Jazeera),۵۴,۱۵۳
الجیریا(Algeria),۵۴,۶۱
الہامی کتب کی توہین پر کنونشن,۶۷
الہامی ہدایت,VI
القاعدہ,۲۹,۱۱۸,۱۱۹,۱۲۶
امام ابن تیمیہ,۵۶,۶۳
اِمانویل کانٹ(Immanuel Kant)جرمن فلاسفر,
۱۶۶
امپیریل ہبرس(Imperial Hubris) ,۱۵۵
امت مسلمہ,۱۴,۶۶,۸۸,۸۹,۹۱,۱۰۹,۱۳۹,۱۴۵,۱۵۹,
۱۷۱, ۱۷۲/امت مسلمہ کا اتحاد, ۱۴۵/ امت
مسلمہ کا اثاثہ,۸۸
امراض قلب,۸
امریکن ورلڈ آرڈر,۱۴۱
امریکہ سپر پاور, ۳۱/امریکہ سے دوستی,۲۶, ۳۴/
امریکہ کا تزویراتی منصوبہ,۱۱۳
امریکہ کی بالادستی,۷۹/امریکہ کے جرائم,۵۶/امریکہ
کی جغرافیائی حکمت عملی,۴۴/امریکہ کے زوال کا
آغاز,۱۴۷
امریکہ کی غلامی, ۱۳۶/امریکہ کا قدامت پسند میڈیا,
۶۲/امریکہ کی مداخلت,۲۶,۱۰۹,۱۲۹
امریکہ کیا چاہتا ہے,۲۶
امریکی استعمار,۳۳,۱۵۹
امریکی انٹیلی جنس, ۱۲۶/امریکی پالیسیاں, ۲۱, ۴۵,
۱۳۷/ امریکی خارجہ پالیسی , ۵۷/امریکی تھنک
ٹینکس,۲۷,۱۵۰/امریکی ٹریبونز,۱۲۶/امریکی ٹی
وی,۱۲۶
امریکی جنگ میں پاکستان کی شراکت,VIII
امریکی حکومت,VII, VIII,۵۴,۱۴۱,۱۵۶
امریکی دار لحکومت,۳۹
امریکی دہشت گردی,۲۶/امریکی سامراج,۶۳
امریکی سفارت خانے,۱۰۱,۱۰۴,۱۰۵,۱۰۶,۱۲۶,۱۳۴
امریکی سفیر,۲۰,۲۴,۴۰,۱۰۳,۱۰۸,۱۱۰,۱۱۱
امریکی سی آئی اے,۱۳۱,۱۳۵
امریکی سینیٹ,۷۵,۱۱۴
امریکی صدارتی انتخابی مہم,۱۷
امریکی فضائیہ,۱۲,۴۳
امریکی فوجی تفتیشی افسران,۵۵
امریکی قانون,۱۲۹,۱۳۳
امریکی قوم,۲۰
امریکی کانگریس,۳۲
امریکی ویب سائٹ,۱۳۵
امن عالم,۳۲,۵۲,۱۴۳
انتہا پسند,۲۸,۶۴
انتہا پسند اسلامی جنگجو,۳۷
انٹرنیشنل اٹامک انرجی کمیشن,۸۳
انٹرنیشنل اٹامک انرجی اتھارٹی,۷۵
انٹرنیشنل کورٹ آف جیورٹس,۱۱۱
انٹرنیشنل ریپبلکن انسٹی ٹیوٹ,۹
انٹیلی جنس ایجنسیاں,۹۵,۱۶۹
انڈونیشیا,۲۶,۱۴۴
انڈیپنڈنٹ،لندن(Independent),۱۳۱
انڈیا,۲۴,۲۹,۴۲,۴۳,۸۵,۱۰۷
انڈیا کے ساتھ ایٹمی تعاون,۲۹
انسان کشی,۱۴۲
انسانی اقدار,۷,۱۶۳

انسانی حقوق, ۷, ۱۳, ۵۲, ۵۵, ۵۶, ۶۰, ۶۶, ۶۷, ۱۱۸, ۱۲۵, ۱۳۰, ۱۶۳, ۱۶۴, ۱۸۰
انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ, ۵۶ / انسانی حقوق کے چارٹر, ۶۰
انسانیت کی تاریخ, ۹۷
انسانیت کا ارتقا, V
انسانیت کے خلاف جرم, ۵۹, ۱۷۹
استعماری گرفت, VI / استعماری نظام کے شکنجے, V
اسٹگلیٹز (Joseph E. Stiglitz) نوبل انعام یافتہ, ۸
انسٹی ٹیوٹ آف اسٹریٹجک اسٹڈیز, ۴۱
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز, VI
انگلستان, ۲۷, ۳۳, ۵۸, ۱۲۵, ۱۵۱
ایڈورڈ کینیڈی (Edward Kennedy), ۱۰۹
ایٹم بم, ۹۷
ایٹمی افزودگی, ۷۳, ۷۴ / ایٹمی پروگرام, ۶۹, ۷۷, ۷۹, ۸۳, ۸۵, ۸۶, ۹۷ / ایٹمی ٹیکنالوجی, ۲۷, ۷۴, ۹۸, ۹۹ / ایٹمی دفاعی صلاحیت, ۷۱, ۷۶, ۷۷, ۸۰, ۸۱ / ایٹمی صلاحیت, ۲۷, ۲۹, ۶۹, ۷۱, ۷۳, ۷۴, ۷۷, ۸۱, ۹۳ / ایٹمی معاہدہ, ۴۴, ۱۳۶ / ایٹمی ہتھیاروں کا مکمل خاتمہ, ۹۹
ایران, ۱۷, ۲۳, ۲۶, ۳۰, ۳۲, ۴۸, ۴۹, ۷۸, ۸۴, ۸۷, ۹۹, ۱۰۰, ۱۳۵, ۱۳۶, ۱۳۹, ۱۴۴, ۱۵۳
ایران پاکستان گیس پائپ لائن, ۱۳۵
ایران پر حملہ, ۴۹, ۸۷, ۱۳۹ / ایران کے ساتھ تعلقات, ۴۹
ایرانی ایٹمی پروگرام, ۸۵
ایرانی حکام, ۸۴
ایشیائی سوسائٹی, ۳۹
ایف بی آئی (فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن) امریکہ, ۵۳
ایلن بی کروگیر (Alan B. Krueger)، ممتاز ماہر اقتصادیات, ۸
ایمل کانسی, ۴۱
ایمنسٹی انٹرنیشنل (Amnesty International), ۱۱۱, ۱۳۰, ۱۶۳, ۱۶۴

ب

باب وڈورڈ (Bob Woodward), ۲۱, ۴۱, ۱۵۱
باجوڑ, ۸۶
باراک اوباما (Barack Obama) (امریکی صدر), ۱۸, ۱۱۰, ۱۱۲
بارڈر روڈ آرگنائزیشن, ۲۳
بدرالزمان صحافی, ۵۴
برطانیہ, ۳۱, ۷۳, ۸۳, ۹۸, ۱۳۹, ۱۵۲, ۱۵۷, ۱۵۹, ۱۶۲, ۱۷۲, ۱۷۴
برطانوی اخبارات, ۳۱, ۵۷ / برطانوی افسر, ۱۷۲ / برطانوی انتداب, ۱۷۲ / برطانوی پارلیمنٹ, ۵۷ / برطانوی کمپنیاں, ۱۳۹ / برطانوی مسلح افواج, ۱۵۲, ۱۷۲
برلس کونی (Berlusconi) اٹلی کا وزیر اعظم, ۳۱, ۶۳
برہنہ تلاشی, ۱۲۹, ۱۳۲
بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیار, ۱۴۰
بش، جارج ڈبلیو (George W. Bush)، امریکی صدر, ۱۱, ۱۶, ۲۱, ۲۲, ۲۳, ۲۵, ۲۸, ۳۱, ۳۲, ۳۳, ۳۷, ۳۸, ۳۹, ۴۰, ۴۳, ۴۴, ۴۵, ۴۶, ۵۰, ۵۷, ۶۰, ۶۲, ۶۴, ۷۵, ۷۹, ۸۰, ۱۰۹, ۱۴۰, ۱۴۱, ۱۴۶, ۱۴۷, ۱۵۳
بش ایٹ وار (Bush At War), ۲۱, ۴۱, ۱۵۱
بش (امریکی صدر) سب سے بڑا انتہا پسند, ۲۸
بغداد, ۱۳۹, ۱۴۹, ۱۵۴
بگرام (Bagram), ۵۸

بلوچستان,۲۳,۱۰۴,۱۱۸,۱۴۹,۱۸۲
بلیک واٹر (Blackwater),۱۰۶, ۱۱۴
بن لادن,۱۵۵
بنکر تباہ کرنے والے میزائل,۱۴۰
بنیاد پرست,۱۵۷
بنیادی انسانی اقدار,۱۶۳
بنیادی حقوق,۱۳۰
بھارت,۱۲,۱۴,۱۷,۱۸,۲۳,۲۴,۲۷,۲۹,۳۴,۳۷,۳۹,
۴۰,۴۳,۴۴,۴۷,۴۸,۷۳,۷۴,۸۵,۸۸,۱۰۷,
۱۳۶,۱۴۴
بھارت امریکہ ایٹمی معاہدہ, ۳۵, ۴۰/ بھارت کی ایٹمی
ٹیکنالوجی,۲۷/ بھارت کا ایٹمی تجربہ,۴۴
بھارتی حکومت,۲۴/ بھارتی فوج,۲۴/ بھارتی لابی,۴۰
بھٹو، ذوالفقار علی,۸۰/ بھٹو، بے نظیر,۱۸۲
بی بی سی (BBC),۱۳۰,۱۶۳
بیت المقدس,۱۷۲
بیرونی امداد,۲۰
بیلجیم (Belgium),۱۴۵
بین الاقوامی ایٹمی توانائی اتھارٹی,۲۹
بین الاقوامی جوہری توانائی کمیشن,۵۷
بین الاقوامی دباؤ, ۱۵۰/ بین الاقوامی دہشت گردی,
۶۰/ بین الاقوامی ریڈ کراس, ۵۴/ بین الاقوامی
فورم,۱۱۶/ بین الاقوامی میڈیا,۱۲۶/ بین الاقوامی
ادارے,۱۴۲
بین الاقوامی این جی اوز,۱۲۳/ بین الاقوامی تعاون,۲۰
بین الاقوامی روایات, ۱۱۲/ بین الاقوامی قانون,
VIII,۵۸,۶۱,۶۴,۱۰۷,۱۱۱,۱۴۲,۱۷۹

پ

پارلیمانی دستور,۳۹
پاک افغان امن جرگہ,۲۹
پاک افغان بارڈر,۱۱۶
پاک امریکہ تعاون, VI, IX
پاک امریکہ تعلقات,۱,۱۷,۱۸,۳۷,۵۱,۱۰۱
پاک امریکہ فری ٹرانزٹ معاہدہ,۱۱۵
پاکستان آبزرور (Pakistan Observer),۸۷
پاکستان ایک خود مختار ملک,۱۰۳/ پاکستان پر فوجی حملوں
کی دھمکیاں,۱۷/ پاکستان کا کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم,
۹۱/ پاکستان کا عدم استحکام, ۱۲/ پاکستان کو امریکی
امداد, ۱۸/ پاکستان کی آزادی, ۷۴, ۱۳۴, ۱۵۹/
پاکستان کی افواج ۱۰۹, ۱۸۰/ پاکستان کے ایٹمی
اثاثوں کی حفاظت,۲۷/ پاکستان کا ایٹمی پروگرام,
۸۳/ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت, ۶۹, ۸۳/ پاکستان
کی خارجہ پالیسی, IX, ۱, ۴, ۱۸, ۲۰, ۳۸/ پاکستان کی
ساکھ,۷۷/ پاکستان کی سلامتی,۱۰۸,۱۱۸/ پاکستان
کی سیاست, X/ پاکستان کی قیادت,۳۸/ پاکستان کی
نظریاتی اساس, VI/ پاکستان کے مفادات, ۴۲,
۱۱۲
پاکستان مسلم لیگ (ق),۳
پاکستان میں امریکی مداخلت, ۲۵/ پاکستان میں مطلوبہ
ٹارگٹ پر حملہ, ۲۵/ پاکستان، بھارت، امریکہ
تکون,۴۳/ پاکستانی بحری وفضائی حدود,۲۴
پاکستانی پارلیمنٹ, ۳۷/ پاکستانی پریس, ۱۰۳/ پاکستانی
رائے عامہ,۱۲۹
پاکستانی سائنس دانوں سے تحقیقات,۶۹
پاکستانی سرحدوں کی خلاف ورزی,۱۲
پاکستانی عوام, ۸, ۹, ۱۰۹/ پاکستانی فوجی, ۶۵/ پاکستانی
قانون,۱۰۶/ پاکستانی میڈیا,۳۸
پالیسی کی تشکیل میں وزارت خارجہ کا کردار,۵
پاول، کولن (Colin Powell),۲۲
پریسلر ترمیم (Pressler Amendment),۱۸
پشاور,۱۱۴,۱۳۵,۱۶۸

پلاننگ کمیشن,۵
پلوٹونیم(Plutonium), ۹۷
پناہ گزینی,۱۱۹
پناہ گیری,۶۱
پنٹاگان,۱۸,۴۱,۱۴۱,۱۵۱
پہلی جنگ عظیم,۱۴۲
پی ای ڈبلیو(Pew)ریسرچ سنٹر,۱۰,۱۲۹
پیرس معاہدہ,۱۴۲
پیشگی حملے(Pre-emptive strike),۴۵,۱۴۳

ت

تاجک,۴۹
تبدیلی کی جہات,۴۷
تحریک استحقاق,۹۲,۹۳,۹۵
تخفیف اسلحہ,۶۹,۹۸
ترکی,۲۶,۱۴۳,۱۴۴,۱۷۹,۱۸۰/ترکی کی پارلیمنٹ,۱۴۳
تزویراتی اثاثوں کا دفاع, ۴۹/تزویراتی شراکت دار, ۴۴/تزویراتی مفادات,۱۵,۱۹,۲۰,۱۳۶
تشدد بطور پالیسی ہتھیار,۵۶
تعلیم,۲۷,۴۴,۵۲,۱۲۲,۱۳۴,۱۴۶,۱۵۷
تہذیبی کشمکش,۱۵۸
تہران,۸۵
توانائی کی سیکورٹی,۸۶
توہین انبیاء,۶۱,۶۷/توہین رسالت,۱۶۵,۱۶۷
تیسری جنگ,۷۳
تیسری دنیا,۶۷,۹۹,۱۰۸,۱۵۴
تیل,۱۴۲,۱۵۱,۱۵۶/تیل کا ہتھیار,۱۴۲/تیل کے ذخائر,۱۴۲/تیل کی لابی,۱۴۲

ٹ

ٹارچر(Torture),۶۱
ٹام ٹینن کریڈو(Tom Tancredo), ۱۷,۱۸
ٹائم(Time)، میگزین,۲۹,۸۳,۸۴,۵۸,۶۲
ٹائن کارپوریشن(Tien Corporation) امریکی سیکورٹی کمپنی,۱۱۴
ٹونی بلیئر(Tony Blair), ۶۰
ٹوئن ٹاورز,۶۰
ٹیکنالوجی کی منتقلی کا معاہدہ,۴۴

ج

جاپان,۹۷,۹۹,۱۴۲,۱۵۱
جان محمد جمالی,۱۲۸
جان نیگروپونٹے(John D. Negroponte),۱۲, ۱۲۶
جائیل لینڈز پوسٹن(Jyllands-Posten)اخبار ڈنمارک,۱۶۵
جدید امریکی استعمار,۱۵۹
جرمنی,۷۳,۸۳,۹۷,۱۴۵,۱۷۴
جماعت الدعوۃ,۱۲۲,۱۲۴
جمہوری ممالک,۱۶۳
جمہوریت,۴۸,۹۸,۱۰۳,۱۴۰,۱۶۰,۱۶۱,۱۶۳,۱۶۸,۱۸۰
جناح(اخبار),۸۹
جنرل اسمبلی,۱۴۷,۱۸۰
جنرل ایوب خان,۳۰,۴۱,۱۱۴
جنرل پرویز مشرف,VII, VIII,۱,۳,۴,۷,۱۴,۱۸,۲۲, ۲۳,۲۴,۳۳,۳۹,۴۰,۴۷,۵۰,۶۳,۶۹,۷۰,۷۲, ۷۶,۷۷,۹۰,۱۰۲,۱۱۴,۱۱۵,۱۲۱,۱۲۸,۱۲۹,۱۳۵, ۱۴۵
جنرل ٹومی فرینکس(Tommy Franks), ۲۳,۴۱

جنرل چوہان, ۹۴
جنرل ڈیوڈ میکنن (General David McKiernan)
جنرل زاہد, ۹۳
جنرل زینی (Anthony Zinni), ۴۱
جنرل ضیاء الحق, ۳۰
جنسی بے حرمتی, ۵۴
جنگی قیدی, ۱۶۴, ۱۷۳
جنوبی ایشیاء, ۳۷, ۴۳
جنوبی کوریا, ۸۸
جنوبی لبنان, ۱۷۵
جنیوا (Geneva), ۶۰, ۶۶, ۱۶۴ / جنیوا کنونشن, ۱۶۴
جہاد, ۶۳, ۱۵۷
جھوٹے خدا, ۵۲, ۱۶۶
جون بیری (John Berry), ۵۳
جوہری افزودگی, ۸۳, ۸۵, ۸۸
جوہری حملہ, ۱۷
جی ایچ کیو, ۳۹, ۴۱ / جی ایچ کیو کا ایک کردار, ۴۵

چ

چیسٹر باولز (Chester Bowles), ۴۴
چین, ۱۵, ۲۳, ۴۴, ۴۷, ۷۳, ۷۸, ۹۸, ۱۱۳, ۱۳۶, ۱۴۴, ۱۴۵, ۱۵۰
چین کے ساتھ تزویراتی تعلقات, ۴۷ / چین کے ساتھ روابط, ۱۵ / چین کی قیادت, ۱۵ / چین کے وزیر خارجہ, ۱۱۳
چیئرمین سینیٹ, ۹۲, ۹۳

ح

حامد کرزئی (صدر افغانستان), ۵۸
حزب اللہ, ۱۲۳, ۱۷۱, ۱۷۴, ۱۷۵, ۱۷۶, ۱۷۸
حضرتِ آدم علیہ السلام, V
حضرت علی کرم اللہ وجہہ, ۱۵۰
حضور پاکؐ, V, ۵۲, ۵۷, ۱۴۶, ۱۶۵, ۱۶۶, ۱۶۹
حق خود ارادیت, ۱۳
حقیقی جمہوریت, ۴۸
حکومتوں کی تبدیلی (Regime change), ۱۴۳
حماس (Hamas), ۱۷۳, ۱۷۵, ۱۷۶, ۱۷۸, ۱۷۹
حیفہ (Haifa), ۱۷۶

خ

خارجہ پالیسی اور قومی مقاصد, ۴ / خارجہ پالیسی پر نظر ثانی, ۶۷, ۷۹, ۱۴۵ / خارجہ پالیسی کا جائزہ, ۳۷, ۳۸, ۵۰ / خارجہ پالیسی کی تشکیل, ۳, ۴, ۵, ۶, ۳۷, ۳۹ / خارجہ پالیسی کے چار ستون, ۱۹
خالد رحمٰن, VI, X
خالد لطیف, ۹۲
خان لیاقت علی خان, ۲۰
خفیہ جیلیں, ۳۲
خود انحصاری, ۱۱۸, ۱۴۳, ۱۴۵
خود حکمرانی, ۴۰
خود کشی, ۸, ۵۴, ۵۵, ۵۸, ۸۹, ۹۱
خود کش حملہ, ۱۶ / خود کش حملوں کے واقعات, ۱۶

د

دبئی, ۱۷۹
دروز (Druze)، شیعہ, ۱۷۵
دنیا کی آبادی, ۱۰, ۵۰
دہشت انگیز جنگ, ۴۶
دہشت گرد تحریکیں, ۱۵۵ / دہشت گرد ریاست, ۱۷۹
دہشت گرد گروپ, ۱۵۵

دہشت گردی کا خاتمہ,۱۱/ مسلم دہشت گردی,۸
دہشت گردی کی تعریف,۶/ عالمی دہشت گردی,۶۱
دہشتگردی کے خلاف جنگ میں تعاون,IX
دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ,۶,۱۷,۱۸,۳۷,۱۲۷
دہشت گردی کے خلاف جنگ,VI,۱,۶,۹,۱۰,۱۶,۱۷,
۱۸,۲۶,۳۱,۳۲,۳۳,۳۷,۴۲,۴۶,۵۹,۶۲,۱۱۰,
۱۱۸,۱۲۱,۱۲۷,۱۳۷,۱۸۲
دہشت گردی کے مرکز,۱۵۵
دوسری جنگ عظیم,۷۳
دی مرچنٹ آف مینیک (The Merchant of
Menace),۸۳
دی نیشن (The Nationa) اخبار,۹۳,۱۳۵,۱۶۶
دی نیوز (The News) اخبار,۱۰۲
دینی ادارے,۱۵۵/ دینی روایات,۱۵۵

ڈ

ڈاکٹر کیلی (Dr. David Kelly),۵۸
ڈان (Dawn) اخبار,۱۰۴
ڈرون حملے,۱۱۰,۱۱۱,۱۱۵
ڈرون حملے ایک جنگی حرکت,۱۱۱
ڈنمارک,۶۳,۱۶۵,۱۶۶,۱۶۷
ڈنمارک کی ملکہ,۶۳
ڈی ایٹ (D-8),۴۹
ڈی بریفنگ,۷۱,۷۶
ڈی جے کالج کراچی,۹۳
ڈی ہائفنیشن (De-hyphenation),۴۳
ڈیٹ لائن پروگرام,۱۶۳
ڈیٹرائٹ (Detroit),۱۳۰
ڈیزی کٹر بم (Daisy Cutter Bomb),۹۹,۱۴۰
ڈیفنس پالیسی,۴۷
ڈیوڈ ٹی جانسن (David T. Johnson),۱۱۴

ر

رابرٹ گیٹس (Robert Gates), ۱۰۵,۱۰۶,۱۰۷
راجیو گاندھی,۴۴
راہداری کی سہولت,۱۱۶,۱۱۷
رائے عامہ کے جائزے,۹
رائے شماری کا حق,۱۳
رچرڈ باؤچر (Richard Boucher), ۱۲۷
رچرڈ نکسن (Richard Nixon)، سابق امریکی صدر,
۳۰
رچرڈ ہالبروک، امریکی سفارت کار (Richard
Holbrooke),۱۳۱
رمز فیلڈ (Donald Rumsfeld), ۵۶,۱۳۹
روٹری کلب,۱۲۳
روس,۲۰,۳۷,۸۳,۹۸,۱۱۴,۱۴۵,۱۵۹
ریاستی دہشت گردی,۱۷۱
ریسرچ اور پالیسی ونگ,۵
ریمنڈ ڈیوس (Raymond Allen Davis), ۱۳۳,
۱۳۴,۱۳۵
رینڈ کارپوریشن (Rand Corporation),۴۲/
رینڈ کارپوریشن کی رپورٹ,۱۵۷

ز

زاکرے کریسٹ ولسن (Zakery Crest Wilson)
انگلستان کے وکیل,۱۲۵
زلمے خلیل زاد (امریکن سفارت کار),۱۰۸

س

سامراجی مغربی ریاست,۱۷۲
سرینڈر کی پالیسی,۱۲۷
سرحدوں کی خلاف ورزی,۱۲,۱۰۴,۱۲۶,۱۲۸

سرد جنگ کا خاتمہ,۱۳۷
سعودی عرب,۲۶,۸۴,۱۴۲,۱۴۴,۱۶۷
سفارت کاری,۱۰۱,۱۵۷
سفارتی اخلاقیات,۱۰۳/ سفارتی آداب,VIII
سفید چمڑی کی برتری,۹۷
سفید نسل,۹۷
سلالہ,۱۱۶
سلامتی کونسل,۱۴۰,۱۴۱,۱۷۵
سوات,۲۸,۱۸۲
سوڈان,۱۰۲
سول نیوکلیئر ٹیکنالوجی,۱۸/ سول نیوکلیئر ٹیکنالوجی کی منتقلی کا معاہدہ,۳۷
سول وار,۴۸
سوویت یونین کا انہدام,۱۳۷
سی آئی اے,۱۵۳,۱۵۵
سی این این (CNN),۱۳۰
سی ٹی بی ٹی,۷۴
سید قطب,۶۳
سیف اللہ پراچہ,۱۲۵
سیکورٹی ایجنسی,۹۲
سیکولر پبلک اسکولنگ,۲۷
سیکولر ایجوکیشن,۲۷
سینیٹ آف پاکستان,۱۷,۱۸,۳۷,۱۶۲
سینیٹ کی انٹیلی جینس کمیٹی,۱۵۱/ انسانی حقوق کمیٹی,۱۲۵/ خارجہ امور کمیٹی,۴
سینیٹر اسفندیار ولی,۱۶۲
سینیٹر اسحٰق ڈار,۱۶۲,۱۶۴
سینیٹر انیسہ زیب طاہر خیلی,۱۶۲
سینیٹر امان اللہ کنرانی,۱۶۲
سینیٹر ایس ایم ظفر,۹۱,۱۶۲
سینیٹر ایم انور بھنڈر (چوہدری),۱۶۲
سینیٹر ثناء اللہ بلوچ,۱۳۹,۱۶۲
سینیٹر پروفیسر خورشید احمد,IX,VIII,VI,۱۷,۳۷,۵۱,۶۹,۸۵,۱۳۹,۱۶۲,۱۶۴
سینیٹر پروفیسر غفور احمد,۱۶۲
سینیٹر سعید احمد ہاشمی,۱۶۲
سینیٹر شہزاد وسیم (ڈاکٹر),۱۶۲
سینیٹر دلاور عباس,۱۶۲
سینیٹر راجہ ظفر الحق,۱۰۶,۱۳۵
سینیٹر رضا ایم رضا,۱۶۲
سینیٹر رضا ربانی,۶,۷۰,۸۵,۹۱,۱۱۰,۱۲۸,۱۶۲,۱۶۴
سینیٹر سعدیہ عباسی,۸۵,۱۶۲,۱۶۴
سینیٹر سمیع الحق (مولانا),۱۳۹,۱۶۲
سینیٹر صفدر علی عباسی,۱۶۲
سینیٹر عبدالرزاق تھہیم,۱۶۲
سینیٹر فرحت اللہ بابر,۷۹
سینیٹر فوزیہ فخر زمان,۱۲۱
سینیٹر گل نصیب (مولانا),۱۱۸,۱۶۲
سینیٹر گلشن سعید,۱۶۲
سینیٹر لیاقت بنگلزئی,۸۵
سینیٹر محمد اسماعیل بلیدی,۱۶۲
سینیٹر محمد سعید صدیقی,۱۶۲
سینیٹر محمد علی درانی,۱۶۲
سینیٹر مشاہد حسین سیّد,۴,۶,۸۵
سینیٹر وسیم سجاد,۸۵,۹۱,۹۲,۱۲۴,۱۶۴,۱۷۱

ش

شاہ ایران,۳۰
شاہ محمود قریشی (وزیر خارجہ),۳
شمالی اتحاد (افغانستان),۲۳,۴۹
شمالی کوریا,۳۲,۷۸,۱۵۳
شمالی وزیرستان,۶۵

شوکت سلطان,۸۹,۹۰
شیر افگن نیازی (ڈاکٹر) وزیر پارلیمانی امور,۱۷
شیریں مزاری (ڈاکٹر),۱۶۶
شیعہ,۱۵۲,۱۷۵,۱۷۶,۱۷۷

ص

صدارتی الیکشن,۲۵
صدام حسین (عراقی صدر),۱۳۹
صدام کی فوجی کابینہ,۱۳۹
صلیبی جنگ,۶۲
صوبہ سرحد,۲۸

ط

طالبان,۷,۲۷,۲۹,۳۷,۴۷,۴۹,۵۸

ع

عالم اسلام,۱۷,۱۵۲ / عالم اسلام کی صورت حال,۱۷
عالم عرب,۱۵۲
عالمگیر احتجاج,۶۵,۱۳۰ / عالمگیر حکمت عملی,۴۴
عالمی تعلقات میں توازن,۴۲
عالمی حالات میں تبدیلی,۴۵
عالمی رائے عامہ,VIII,۴۵,۱۴۶,۱۶۲,۱۷۷
عالمی سلامتی کا نظام,۱۴۳
عالمی شراکت دار,۴۴ / عالمی طاقت,۴۴
عالمی فوجداری عدالت,۱۸۰
عالمی میڈیا,۳۸
عالمی نظام کی تشکیل,۱۳۷
عام انتخابات,VIII
عبدالقدیر خان (ڈاکٹر اے کیو خان),۲۷,۷۰,۷۳,۷۵,
۸۰,۸۳,۸۴,۸۵,۸۶,۸۷,۸۹,۹۰,۹۲,۹۴,۹۹,
۱۲۱ / اے کیو خان پر فالج کا حملہ,۸۷ / خان کی صاحبزادی,۹۳
عراق,۸,۲۶,۳۱,۳۲,۳۳,۴۶,۵۷,۵۸,۷۵,۸۰,۸۶,
۱۰۷,۱۰۹,۱۱۰,۱۳۵,۱۳۹,۱۴۰,۱۴۱,۱۴۲,۱۴۳,
۱۴۴,۱۴۶,۱۴۷,۱۴۹,۱۵۰,۱۵۱,۱۵۲,۱۵۳,۱۵۴,
۱۵۶,۱۵۸,۱۶۰,۱۶۱,۱۶۲,۱۶۳,۱۶۴
عراق پر حملہ,۵۷,۷۵,۱۳۹,۱۴۱,۱۴۹,۱۵۰,۱۵۱,۱۵۳
عراق پر حملہ ایک بین الاقوامی سازش,۱۵۰
عراق جنگ,۳۳,۱۴۳,۱۳۹,۱۶۰ / عراق کا مسئلہ,۱۵۴,
۱۵۸ / عراق کی جیلیں,۱۶۲ / عراق میں قابض / فوجیوں کے مظالم,۱۶۲ / عراقی اپوزیشن,۱۵۲ / عراقی عوام,۱۵۲,۱۶۲
عرب اخبارات,۵۴ / عرب حکمراں,۱۷۷ / عرب دنیا,
۱۴,۱۷۲ / عرب قیدی,۵۴ / عرب لیگ,۱۴۵,
۱۷۴ / عرب ممالک,۱۷۷
علاقائی سلامتی,۱۱۷
عمران خان,۵۲

غ

غزہ (Ghaza),۱۷۴,۱۷۹
غلامی کی علامت,۱۱۷
غیر مسلم دشمن,۵۶

ف

فاروق (ڈاکٹر) سائنسدان,۹۰
فٹ بال کا امریکی ہیرو,۵۸
فرانس,۲۷,۴۳,۷۴,۹۸,۱۴۵
فرنٹ لائن اسٹیٹ,۱۸
فریڈم فلوٹیلا پر حملہ,۱۷۹
فضل الرحمٰن (مولانا) قائد حزب اختلاف,۱۱۹

فلسطین,۱۵۶,۱۷۱,۱۷۲,۱۷۳,۱۷۴,۱۷۵,۱۷۶,۱۷۹,
۱۸۱/فلسطین کا مسئلہ,۱۵۶/فلسطین کا مسئلہ حق
خودارادیت,۱۸۱/فلسطین کی آزادی,۱۷۹/
فلسطینی حکومت,۱۷۲
فلوجہ(Fallujah),۱۴۹
فوجی صنعتی کمپلیکس (Military Industrial
Complex),۱۴۲
فوجی قیادت اور عوام کے درمیان بے اعتمادی,۷۸
فوجی مہمات,۲۵
فوجی وسلامتی کے معاملات,۱۰
فیصل شہزاد(پاکستانی امریکن),۱۸۰

ق

قبائلی لشکر,۱۰۹
قتل وغارت گری,۶۱
قدامت پرست,۱۵۷/قدامت پسند,۶۲
قرآن پاک کی بے حرمتی,۵۱,۵۲,۵۴,۵۸,۱۰۳
قرآن پاک کے تقدس کی حفاظت,۵۲
قرآن وسنت,V
قومی اتفاق رائے,۴۸,۷۹,۸۱,۱۱۸,۱۴۶
قومی اسمبلی,۱۸,۵۳,۶۸
قومی انتخابات,۱۲۷
قومی سلامتی کی قرارداد,۱۰۶

ک

کابل,۱۴,۲۳,۲۹,۴۹/کابل پر کنٹرول,۴۹
کانگریس کمیٹی,۹۰
کثیر قطبی دنیا,۱۴۷
کراچی,۹۲,۱۳۵
کرپشن,۷۲,۷۳
کرد(Kurd),۱۳۹,۱۵۲
کرسٹینا روکا(Christina B. Rocca),۵۵,۶۰
کرنٹ ہسٹری(Current History)امریکہ کا نمایاں
میگزین,۳۱
کشمیر,۴,۱۲,۱۳,۳۴,۴۰,۴۳,۴۹/کشمیر کا مسئلہ,۱۲
کشمیر کی پالیسی,۳۴/کشمیر کی جدوجہد آزادی,۱۳
کلنٹن(Bill Clinton),۴۴,۴۵
کنگ ڈیوڈ ہوٹل(King David Hotel),۱۷۲
کوفی عنان(Kofi Annan)اقوام متحدہ کے سیکرٹری
جنرل,۱۷۴
کونڈولیزا رائس(Condoleezza Rice),۴۰,۱۲۰,
۹۰
کویت(Kuwait),۱۴۰
کوئٹہ,۱۳۵,۱۸۲
کیری لوگر بل(Kerry Lugar Bill),۱۸۰
کینسر,۸,۹۴
کینیڈا,۲۷,۶۶,۱۴۵
کیوبا,۴۵,۵۸,۱۲۷
کے آر ایل(کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز),۶۹

گ

گارڈین(Guardian),۴۶,۹۰,۱۳۶
گلوبل ایٹی ٹیوڈ(Attitude)سروے,۱۰
گوانتاناموبے(Guantanamo Bay),۵۱,۵۴,۵۵,
۵۹,۱۰۲,۱۰۱,۱۲۵,۱۶۴
گورڈن براؤن (Gordon Brown)برطانوی وزیر
اعظم,۳۱
گیس پائپ لائن معاہدے,۱۳۶

ل

لاپتہ افراد,۱۱۸,۱۲۵

لادین,۱۵۷
لارڈ بٹلر(Lord Butler) کی رپورٹ,۱۵۱
لاس اینجلس ٹائمز(Los Angeles Times),۴۶
لاطینی امریکہ,۴۵
لال مسجد (جامعہ حفصہ),۱۶,۱۸,۲۸,۱۸۲
لاہور,۱۳۳,۱۳۵,۱۶۷,۱۶۸
لبنان,۱۲۳,۱۲۷,۱۷۱,۱۷۳,۱۷۴,۱۷۵
لندن,۳۳,۸۴,۱۳۶
لیبارٹریز کی تلاشی,۸۰
لیبیا,۷۸,۱۶۷
لیفٹیننٹ جنرل صفدر,۶۵
لیموندے(Le Monde) فرانسیسی اخبار,۱۶۵
لیون پنیٹا(Leon Panetta) امریکی وزیر دفاع,۱۱۰

م

مارک ڈی فالکوف(Marc-D Falkoff),۵۴
مارگریتھ II(Margrethe II),۶۳
ماریانہ بابر صحافی,۱۰۲
متحدہ مجلس عمل,۵۲,۱۶۴
مجرم کی اعانت,۶۵
محتسب,۱۱۷
محمد بن عبدالوہاب,۶۳
محمد میاں سومرو قائم مقام صدر,۹۴
مدرسہ,۹,۱۵۵
مدینہ,۱۷,۱۸
مذہب کی علامتوں کو ٹارچر کے لیے استعمال کرنا,۶۱
مذہبی اقدار,۶۱
مذہبی علامتوں کا استعمال,۶۷
مذہبی قدامت پسند ذہن,۲۶
مستشرقین,۱۵۷
مسلم حکمران,۱۴/ مسلم امت,۱۰۸,۱۷۷/ مسلم ایٹم جی اوز,۱۲۱/ مسلم حکومتوں کا کردار,۱۷۶
مسلم دنیا سے تعلقات,۷۷/ مسلم دنیا کے معاشی وسائل,۵۰/ مسلم عوام,۱۴
مسلم ممالک,۱۱,۶۴,۶۶,۶۷,۷۸,۱۲۹,۱۳۰,۱۳۲,۱۳۳,۱۴۴,۱۵۷,۱۷۴,۱۷۷,۱۸۰
مسلم ممالک کے لیے مشترکہ دفاعی پالیسی,۱۷۷
مسلمان فقہاء,۵۶
مسلمان کی شناخت,۵۷
مسلمان مقبوضہ ممالک,۱۷۷
مسلمانوں کے خلاف جنگ,۲۶
مشرق وسطی,۱۳,۱۴۲,۱۵۳,۱۵۸
مشرق وسطی کی تنظیم نو,۱۴۲
مصر,۶۱,۸۴
معاشی احتجاج,۱۶۷
معاشی امداد,۱۱۷
مغربی اقوام,۱۳۹,۱۶۷
مغربی مفادات,۱۴
مغربی میڈیا,۱۶۷
مقدس کتابوں کی تقدیس,۶۷
مقدس مقامات,۱۵۰
مکران,۱۳۶
مکہ,۱۷,۱۸
ملائشیا,۲۶
ملت اسلامیہ,۶۸
ممبئی,۱۰۷
مملکت کی آزادی,۱۱۷
مہذب معاشرے کی روایات,۵۲
میجر جنرل ہڈ(Major General J. Hood),۱۰۱,۱۰۲
میخائل شیور(Michael Scheuer),۱۵۵
میکسیکو,۱۱۹,۱۴۵

ن

نادرن الائنس,۲۲
نارتھ ویسٹ ایئرلائن,۱۳۰
ناگاساکی(Nagasaki)جاپان,۹۷
نائجیرین,۱۳۰,۱۳۱
نائن الیون(۹/۱۱), ۶۲, ۷۹, ۸۰, ۱۰۹, ۱۶۵/نائن الیون(۹/۱۱) کمیشن, ۶۲/نائن الیون(۹/۱۱) کے بعد کی خارجہ پالیسی, ۲۱/نائن الیون (۹/۱۱) کے واقعات, VII, ۷, ۶۰, ۱۵۱/نائن الیون (۹/۱۱) کمیشن کی رپورٹ,۱۵۱
نجف الاشرف,۱۴۹,۱۵۴
نجی سیکورٹی ایجنسی,۱۱۴
نسل کشی,۱۷۱,۱۷۴
نمونیہ,۸
نوآبادیاتی طاقتیں,۱۷۳/نوآبادیاتی حکمراں,۶/ نوآبادیاتی ورثہ,۶
نوائے وقت,۹۱,۱۲۶
نوقدامت پسندوں کی لابی,۱۵۱
نیٹو(NATO),۱۲,۲۵,۲۹,۱۰۴,۱۰۵,۱۱۰,۱۱۶,۱۴۴, ۱۷۷
نیٹو افواج,۱۲,۱۱۶
نیٹو کے امریکی کمانڈر,۱۰۴/نیٹو کے کمانڈر,۱۰۵
نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی,۸۰
نیشنل ریویو(National Review),۶۲
نیویارک ٹائمز(New York Times),۳۸,۴۶, ۷۹,۱۲۶
نیوزویک(Newsweek)ممتاز امریکی جریدہ,۵۱,۵۲, ۵۳,۵۴,۵۵
نئی عالمگیر گروہ بندی,۱۴۵

و

وحی,V
واشنگٹن امریکی دارالحکومت,۱۲,۲۱,۳۰,۳۲,۳۹,۴۳, ۴۶,۱۰۱,۱۲۶
واشنگٹن پوسٹ,۴۳,۴۶,۱۲۶,۱۳۴
وائٹ ہاؤس,۳۲,۴۱,۵۳
وائسرائے,۲۷,۱۰۳/وائسرائے حکمران,۲۷
وزیرستان,۲۵,۶۵,۹۱
وسطی ایشیا,۱۱۷
وسیع پیمانے پر تباہی کے ہتھیار,۵۷
وولفووٹز(Wolfowitz)امریکی ڈپٹی سیکرٹری ڈیفنس, ۱۵۱
ویٹو(Veto),۱۴۷,۱۷۵,۱۸۰
وینڈی چیمبرلین(Wendy Chamberlain) امریکی سفیر,۲۴

ہ

ہتک عزت کا قانون,۶۷
ہتھیاروں کی تیاری,۵۷,۸۶
ہٹلر(Adolf Hitler),۹۷
ہجرت,۶۱
ہن ٹنگٹن(Samuel P. Huntington),۱۰۰
ہندوستان,۱۲,۱۳,۲۳,۲۴,۳۹,۹۳,۱۰۵,۱۰۷
ہندوستان سے تعلقات,۱۲
ہنری کسنجر(Henry Kissinger)سابق امریکی وزیر خارجہ,۸۰
ہنٹر(Hunter)کی رپورٹ,۱۵۱
ہیرالڈ ٹریبیون(Herald Tribune)اخبار,۵۸,۱۵۳, ۱۵۲,
ہیروشیما(Hiroshima),۹۷

ہیمنت کرکرے(Hemant Karkare),۱۰۷
ہیومن رائٹس واچ,۵۴,۱۱۱

ی

یک قطبی,۱۴۵,۱۴۷
یمن,۵۴,۶۱,۱۳۱
یہودی,۱۵۰,۱۷۲/یہودی سرزمین,۱۷۲
یوایس نیوز,۱۳۴
یواین چارٹر,۱۴۲,۱۴۷
یورپ کی اسلحہ کی صنعت,۱۷۸
یورپ کی انسانی حقوق کی عدالت (Strasbourg Court),۱۳۰
یورپی عدالت,۱۲۹/یورپی میڈیا,۱۵۸/یورپی یونین,۶۶,۱۶۷,۸۵,۱۴۳,۱۷۵/یورپی یونین کی ممبرشپ,۱۴۳
یورپین اقوام,۱۷۳/یورپین ممالک,۱۴۲
یورینیم,۹۷,۹۸,۱۴۰/یورینیم افزودگی کی تحدید,۹۸/یورینیم سے افزودہ بم,۱۴۰